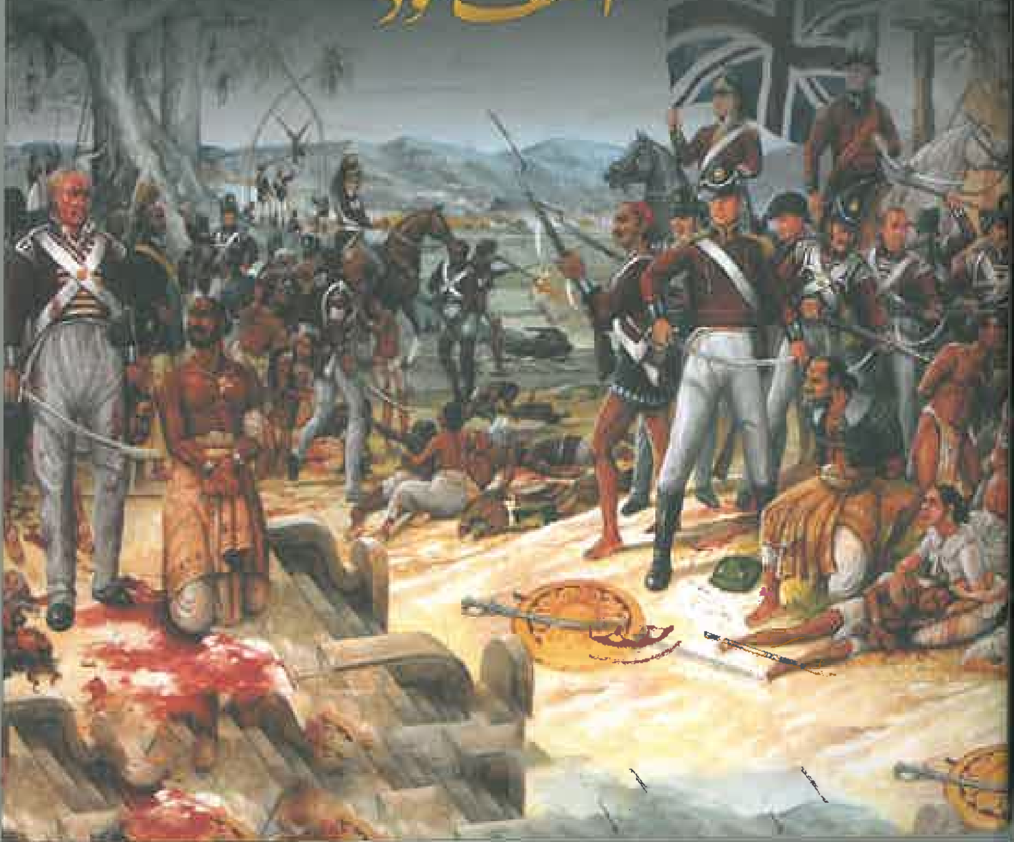
پسِ قانون

پاکستانی قانون پر برطانوی نوآبادیاتی اثرات

آصف محمود



ہمارے ملک میں اس وقت ہزاروں کی تعداد میں ایسے قوانین نافذ ہیں جو انگریزوں نے وضع کیے تھے اور پھر یہاں سے جاتے جاتے "قانونِ آزادیِ ہند، ۱۹۴۷ء" کے تحت ان قوانین کا بوجھ ہمارے نظام پر لاد گئے۔ جناب آصف محمود صاحب کی کتاب "پس قانون" ان قوانین کے پیچھے چھپے ہوئے اصل مفروضوں سے پردہ اٹھاتی ہے اور اس شاخِ نازک پر بنائے گئے آشیانے کے متعلق بہت اہم تفصیلات ہمارے سامنے لاتی ہے۔ یہ کتاب واضح کرتی ہے کہ یہ قوانین انصاف فراہم کرنے کے لیے نہیں بلکہ غلاموں کی خوئے غلامی کو پختہ تر کرنے کے لیے آقاؤں کی جانب سے بنائے گئے تھے۔ یہ کتاب سوال اٹھاتی ہے کہ آزادی کے ۷۵ سال بعد بھی کیوں ہم ان قوانین سے پیچھا نہیں چھڑا سکے؟

جناب آصف محمود کا تجزیہ کہتا ہے کہ جب تک ہمارے قانونی اور عدالتی نظام کی بنیادیں تبدیل نہیں کی جاتیں، جب تک ہمارے ججز، وکلاء اور قانون کے اساتذہ و طلبہ قانون کے متعلق بنیادی تصورات چھوڑ نہیں دیتے اور جب تک پس قانون مفروضات تبدیل نہیں ہوتے، تب تک قانون میں ترمیم اور تبدیلی سے کچھ نہیں ہوگا، نہ ہی صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ قوانین اب ہمارے آئین کے ماتحت ہیں۔ جناب آصف محمود صاحب کا کہنا ہے کہ ہمیں نئی بیوروکریسی، نئے اصولوں اور نئے قوانین کی ضرورت ہے کیونکہ ہم اب غلام نہیں، شہری ہیں۔

کیا ہماری "قانونی برادری" غلاموں کے لیے قوانین اور شہریوں کے لیے قوانین میں فرق پر غور کرنے کے لیے تیار ہے؟ اگر ہاں، تو یہ کتاب ہر جج، ہر وکیل، قانون کے ہر استاد اور قانون کے ہر سنجیدہ طالب علم کے مطالعے کی میز پر ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد

سربراہ شعبہ قانون

شفاء تعمیر ملت یونیورسٹی، اسلام آباد

پسِ قانون

پاکستانی قانون پر برطانوی نوآبادیاتی اثرات

آصف محمود

چودھری ظہیر الدین گوندل کے نام
سار ی دعاؤں کے ساتھ

Pas-i Qānūn: Pākistānī Qānūn par Bartānwī Naw Ābādyātī Atharāt
By Asif Mahmood
ISBN 978-627-7504-05-2

ناشر: اسد جبین ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، شیبانی فاؤنڈیشن، اسلام آباد
اشاعت: جنوری 2023ء
نام کتاب: پسِ قانون: پاکستانی قانون پر برطانوی نوآبادیاتی اثرات
مصنف: آصف محمود
مطبع: سہیل الطاف پرنٹرز، راولپنڈی

✉ shaybanifoudation.pk@gmail.com ✆ +92-333-5915287

فہرست

پیش لفظ

ہمارا آئین کہتا ہے کہ ہر مدعی کو جلد، فوری اور سستا انصاف بہم پہنچانا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ میں نے اپنے سپریم کورٹ کے دور میں تحقیق کروائی تو پتہ چلا کہ ایک سول مقدمے کو سول کورٹ سے سپریم کورٹ تک پہنچنے میں اور حتمی فیصلہ ہونے میں اوسطاً پچیس سال لگتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے اور اس سے کون سے آئینی تقاضے پورے ہوتے ہیں؟ میں محسوس کرتا ہوں کہ مولانا روم کی حکمت پر عمل کیے بنا کچھ نہیں ہوگا:

هر بنای کهنه که آباداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

جو بنائے کہنہ ہے، اس کو آپ تعمیر کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کی بنیادیں وہی ہیں، تو سب سے پہلے آپ نے اسے جڑوں سے یا بنیادوں سے اکھاڑنا ہے۔ میں اپنے چوالیس سالہ تجربے کی بنیاد پر یہ عرض کرتا ہوں کہ اس کے بغیر یہاں کوئی بامعنی اصلاح شاید ممکن نہ ہو کیونکہ جس بنیاد پر آپ ڈھانچہ کھڑا کر رہے ہیں وہ بنیاد اس کو برداشت نہیں کر سکے گی۔

ہمارا عدالتی نظام انگریزی کامن لاء کی بنیادوں پر کھڑا ہے۔ کامن لاء کے کچھ طریقے اور اصول ہیں جن میں ایک واسطے (intermediary) کا ہونا بہت ضروری ہے، اور وہ ہے وکیل، اور ہمارے نظام میں اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس نظام میں، جسے مخاصمت کا نظام (adversarial system) کہتے ہیں، جج کا کام ان امور تک محدود رہتا ہے جو مقدمے کے فریقین اس کے سامنے رکھیں۔ جج فریقین کے دعویٰ اور جواب دعویٰ کو دیکھتا ہے، دونوں جانب کے پیش کردہ شواہد کا جائزہ لیتا ہے اور فریقین کے دلائل تک محدود رہتے ہوئے فیصلہ کرتا ہے۔ لہٰذا انصاف تک رسائی ریاست کی ذمہ داری نہیں رہتی بلکہ سائل اور مظلوم کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ اسے پہلے وکیل ڈھونڈ کر اس کا محنتانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور ہمارے رائج نظام میں بھاگ

دوڑ کرنا اور شواہد اکٹھے کرنا سائل ہی کی ذمہ داری ہے۔ فوجداری مقدمات میں تفتیش کا کام پولیس کے ذمے سونپا گیا ہے مگر وہاں بھی سائل کو وکیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں آصف محمود صاحب نے پولیس کے نظام کا بہت عمیق جائزہ لیا ہے۔

اسلامی نظام میں قاضی انگریزی کامن لاء کے جج سے بہت مختلف تھا۔ اس میں عدل کو یقینی بنانا قاضی کی ذمہ داری تھی۔ اس وجہ سے اگر قاضی محسوس کرتا کہ فریقین کسی اہم امر کو سامنے نہیں لا رہے جس کا تعین کیے بغیر عدل ممکن نہیں، تو اسے سامنے لانے کا اختیار قاضی کے پاس ہوتا تھا۔ کوئی شخص بظاہر مظلوم ہے لیکن ظالم کے خلاف اس کے پاس بارِ ثبوت نہیں ہے، تو قاضی حکومتی مشینری کو استعمال کر کے پتا چلا سکتا تھا کہ کیا واقعی اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے یا نہیں۔

اس سے ملتا جلتا نظام سول لاء والے ممالک میں رائج ہے اور اسے تحقیق کا نظام (inquisitorial system) کہتے ہیں۔ اس نظام میں قاضی اپنی طرف سے سوال بھی متعین کر سکتا ہے، کوئی تنقیح طلب امر بھی متعین کر سکتا ہے اور شواہد اکٹھے کرنے کے لیے کسی کو ذمے داری بھی سونپ سکتا ہے۔ یہاں قاضی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوتا ہے۔ اسلامی اصولوں میں قضاء کا کام ریاست کی ذمہ داری ہے۔ قاضی اگر خود صاحبِ علم نہ ہو تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ فقہاء اور اہلِ علم سے مدد حاصل کرے۔ سائل یا مظلوم نے صرف ریاست کے قائم کردہ نظامِ قضاء کو اپنی شکایت پہنچانی ہے اس کے بعد ریاستی نظم اور دادرسی کے ادارے انصاف کی فراہمی بہم پہنچانے اور اسے یقینی بنانے کے پابند ہیں، چاہے سائل کے پاس وسائل اور ہمت ہو یا نہ ہو۔

میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ کچھ چیزیں سیاست کی بھینٹ بھی چڑھیں۔ زبان ہی کا مسئلہ لے لیجیے۔ یہاں پر ہماری انگریزی کا کیا معیار ہے، میں کئی مواقع پر کہہ چکا ہوں کہ پاکستان میں تقریباً تین ہزار جج صاحبان ہیں اور ان میں کم ہی ایسے ہیں جو معیاری انگریزی لکھ سکیں۔ زبان کا مقصد رٹے ہوئے الفاظ اور رٹے ہوئے جملے دہرانا نہیں ہے۔ معیاری انگریزی وہ نہیں جانتے

لیکن لکھنا انھوں نے ضرور انگریزی میں ہی ہے۔ یہ ذہنی غلامی ہے۔ ہمارے آئین کی رو سے اردو ہماری قومی زبان ہے اور اس کے علاوہ صوبائی زبانیں بھی ہیں جن کی ترویج آئین نے صوبوں کے ذمے ڈال دی ہے۔ اردو کے علاوہ اگر ہمارا آئین کسی زبان کی ترویج کا ذکر کرتا ہے تو وہ صوبائی زبانیں ہیں، نہ کہ انگریزی۔

میں نے اس موضوع پر سپریم کورٹ کے فیصلے کی تمہید میں لکھا کہ ایک زمانہ تھا جب رومی سلطنت میں تمام تر قانون لاطینی زبان میں لکھا گیا۔ پادری اور راہب تو اس کو سمجھتے تھے لیکن ساری رومی سلطنت میں اور کوئی بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ادھر برصغیر میں سنسکرت کے حصار میں قانون کو بند کر دیا گیا جو پنڈتوں شاستریوں کی زبان تو تھی، اور کسی کی بھی نہیں تھی۔ اس کے بعد فارسی آگئی۔ میں خود فارسی کا مداح ہوں اور حافظ شیرازی، مولانا روم، حکیم سنائی غزنوی کی حکمت سے میں نے اپنے آئینی فیصلوں میں مباحث اخذ کر کے لکھے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ فارسی نہیں بلکہ اردو اور صوبائی زبانیں ہی پاکستان میں عام آدمی کی سمجھ میں آتی ہیں اور ان ہی کے ذریعے وہ ایک دوسرے سے مکالمہ کرتے ہیں۔

میرا اردو والا فیصلہ آیا تو انتظار حسین صاحب نے ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے ایک خوبصورت بات لکھی تھی کہ یہ لوگ خائف ہیں کہیں عوام الناس کو پتہ نہ چل جائے کہ ان کا آئین کیا کہتا ہے، ان کا قانون کیا کہتا ہے اور ان کے حقوق کیا ہیں۔ یہی چیز تفریق کا باعث بن رہی ہے۔ زبان کو ہمارے ہاں حکمرانی کے لیے ایک حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ طبقاتی تقسیم کا آزمودہ نسخہ ہے۔ اگر زبان کا مقصد لوگوں کو ان کے حقوق سمجھانا ہے تو انگریزی اس کو پورا نہیں کرے گی۔ یہ کام صرف اردو اور صوبائی زبانوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ پاکستان کے شہریوں کو ان کے قانونی حقوق تک دسترس دینا، جیسے اوپر کہا گیا، ریاست اور ریاستی اداروں کی ذمہ داری ہے۔ یہ دسترس اس زبان میں ہی فراہم کی جاسکتی ہے جو وہ سمجھتے ہیں۔ یقیناً پاکستان میں وہ زبان

انگریزی نہیں۔ یہ معاملہ زبان سے زیادہ آئین کی بالادستی کا اور قانون کی عمل داری کا ہے۔ جب تک آئین موجودہ شکل میں ہے اور اس میں آرٹیکل 251 موجود ہے، جج صاحبان اور وکلاء اس آرٹیکل کے مندرجات کے پابند ہیں۔ اس میں ان کی ذاتی ترجیح یا صوابدید کا عمل دخل نہیں ہے۔

میں شکر گزار ہوں اس کتاب کے فاضل مصنف جناب آصف محمود کا جنھوں نے اس اہم موضوع پر اعلیٰ درجے کی تحقیق کر کے اسے اردو میں عام فہم اسلوب میں پاکستان کے عوام کے سامنے رکھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے قانونی و عدالتی نظام میں بامعنی اصلاحات کے خواہش مند افراد یہ کتاب شوق سے پڑھیں گے اور یہ ججز، وکلاء اور قانون کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ عام لوگوں کے لیے بھی بہت مفید ثابت ہو گی۔

جواد ایس خواجہ
سابق چیف جسٹس آف پاکستان
29 دسمبر، 2022ء

دیباچہ

سستا اور فوری انصاف پاکستان کے سیاسی بیانیے کا اہم جزو ہے۔ کسی بھی سیاسی جماعت کا منشور اٹھا کر دیکھ لیجیے، یہ بات اسلوب کے فرق کے ساتھ ہر جگہ ملے گی۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ سستا ہے، فوری ہے اور نہ ہی، بعض صورتوں میں انصاف ہے۔ قانون کی دنیا کا مسلمہ اصول ہے کہ انصاف میں تاخیر انصاف کی نفی کے مترادف ہے اور سابق چیف جسٹس جناب جسٹس جواد ایس خواجہ کی گواہی یہ ہے کہ ایک دیوانی مقدمے میں انصاف کے حصول کے لیے اوسطاً پچیس سال درکار ہوتے ہیں۔ یہ اب اہل فکر و نظر کا کام ہے کہ وہ سوچیں اس تاخیر کے بعد جو ملتا ہے وہ انصاف ہوتا ہے یا محض ایک فیصلہ ہوتا ہے۔

دعوت فکر دینے کو بہت سے مظاہر دستیاب ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں غلام سرور اور غلام قادر نامی ملزمان جب سپریم کورٹ سے بری ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے انھیں تو سال پہلے ہی پھانسی دی جا چکی۔[1] اسی طرح ہم دیکھتے ہیں مظہر فاروق نامی شخص کو جب سپریم کورٹ بے گناہ قرار دیتی ہے تو وہ اپنی زندگی کے چوبیس سال قید میں گزار چکا ہوتا ہے۔[2] عاصمہ نواب کو جب یہ نظامِ قانون بے

[1] دیکھیے: اداریہ ڈان "Wrongfully hanged"، 24 اکتوبر 2016ء۔

[2] رافعہ ذکریا، "Acquittal after execution"، ڈان، 7 دسمبر 2016ء۔

گناہ قرار دیتا ہے تو اسے قید ہوئے بیس سال گزر چکے ہوتے ہیں۔[3]

پولیس کا رویہ بھی اس سماج کے مشاہدے کی چیز ہے اور اسے بیان کی حاجت نہیں۔ ایسے ایسے سانحات نے جنم لیا ہے کہ دل لہو ہو جاتا ہے۔ المیہ مگر یہ ہے کہ درد کی یہ کہانیاں بھی پارلیمان کے اندر قانون سازی کے باب میں کسی سنجیدہ بحث کو جنم نہیں دے پاتیں۔ کوئی حادثہ ہوتا ہے تو ہلکا سا ایک اضطراب پیدا ہوتا ہے اور پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔

اس نظام قانون پر خلق خدا کا عدم اعتماد اب کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ سوال البتہ یہ ہے کہ خرابی کہاں ہے؟ اس سوال کا جواب بہت طویل بھی ہو سکتا ہے اور ہمہ جہت بھی لیکن یہ جواب بہت یکسوئی، اختصار اور وضاحت کے ساتھ دیا جا سکتا ہے کہ خرابی کی بنیاد کیا ہے؟

خرابی کی بنیاد برطانوی غلامی کے دور میں مسلط کیے گئے اس نو آبادیاتی نظام قانون میں ہے، جسے آج بھی ہم ایک اثاثہ اور آخری آفاقی حقیقت سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ برطانوی کامن لاء کی واردات چوں کہ صرف قانونی واردات نہیں تھی بلکہ یہ ایک پورا نظام زندگی تھا جو سامراج نے برصغیر پر مسلط کیا، اس لیے اس کے اثرات بھی صرف قانون کی دنیا تک محدود نہیں۔ اس واردات نے ایک ایسی نسل کو جنم دیا جو اپنی تہذیبی شناخت کے ہر حوالے پر نادم ہے اور جس کا احساس کمتری اسے ہر دم یاد دلاتا رہتا ہے کہ نظامِ معاشرت سے نظامِ قانون تک، معیار صرف وہ ہے جس کی جڑیں برطانوی نو آبادیات میں ہیں۔

---

[3] دیکھیے: اداریہ ڈان "Asma Nawab's wrongful imprisonment sheds light on slow justice"، 20 مئی، 2018ء۔

برطانوی نو آبادیاتی بندوبست کی تعمیر میں ہی خرابی ہے۔ ہمارا قانونی اور انتظامی ڈھانچہ آج بھی وہی ہے جو انگریزوں نے برصغیر پر قبضے کے بعد متعارف کرایا تھا۔ یہ نظام شہریوں کے لیے نہیں تھا، یہ رعایا کے لیے تھا۔ اس نظام قانون میں کسی مقامی مشاورت کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ یہ سامراج کے ذہن نے اپنے مفادات کی روشنی میں تیار کیا تھا۔ اس نظام قانون کا بنیادی مقصد انصاف دینا نہیں تھا بلکہ اس امر کو یقینی بنانا تھا کہ آئندہ کوئی گستاخ 1857ء کی جنگ آزادی جیسی گستاخی نہ کر سکے۔ چنانچہ اس نظام میں ایک فرد کی حیثیت نوکر، غلام اور رعیت کی ہے، شہری کی نہیں۔ نوکر اور غلام کو اگر انصاف مل جاتا ہے تو یہ اس کا حق نہیں، یہ اس کے مالک اور آقا کی عطا ہے۔ رعیت کو آقا سے شکوہ کی آزادی نہیں ہے۔

اس نظام میں یہ اہتمام بھی موجود ہے کہ نظام قانون، انصاف کی جلد فراہمی کے عامل کے بجائے ایک دلدل کی صورت اختیار کر جائے تا کہ مقامی لوگ اسی میں الجھے رہیں اور برطانوی نو آبادیاتی بندوبست کے لیے کسی درد سر کا باعث نہ بنیں۔ دور غلامی ختم ہوئے مدت ہوئی لیکن ہم ابھی تک دور غلامی کے قانون اور اس سے لپٹی ساری روایات کو آفاقی صداقت کے طور پر اختیار کیے بیٹھے ہیں اور ہمارے فیصلہ سازوں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ اس نظام قانون نے ایک عام آدمی کو آخر کیا دیا ہے۔ اشرافیہ کا کوئی مقدمہ سامنے آ جائے تو اس نظام قانون کی قباحتیں کچھ روز کے لیے بحث کا موضوع بن جاتی ہیں لیکن خلق خدا پر کیا بیت رہی ہے، یہ اب سرے سے کوئی خبر ہی نہیں رہی۔

قیام پاکستان کے وقت اس سارے نظام کو عارضی طور پر اختیار کر لیا گیا۔ 14 اگست 1947ء کو جاری ہونے والے عبوری آئینی حکم نامے میں یہ اصول طے کر دیا گیا تھا کہ یہ ایک

عارضی بندوبست ہے۔ چنانچہ لکھ دیا گیا کہ برطانوی دور کے قوانین تب تک ہمارے قانون کے طور پر نافذ رہیں گے جب تک نئے قوانین نہیں بن جاتے یا ان میں ترمیم نہیں کر لی جاتی۔ یہی اصول ہم نے 1956ء کے آئین میں بھی اختیار کیا اور اسی کا تذکرہ 1962ء کے آئین میں بھی ہے۔ 1973ء کے آئین میں بھی یہی نکتہ آرٹیکل 268 میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن آج بھی آئینی طور پر یہ ایک عارضی بندوبست ہی ہے۔

ایک آزاد ریاست کے طور پر آئینی مبادیات اور فکری سمت کے از سر نو تعین کے باب میں قائداعظم نے شروعات میں ہی غیر معمولی بنیاد رکھ دی تھی۔ وہ اگر کچھ عرصہ زندہ رہ جاتے تو یقیناً اس نوآبادیاتی نظام قانون کا سارا ڈھانچہ ہی بدل دیتے لیکن وقت نے انھیں مہلت نہیں دی اور ان کے بعد ہم ایسی داخلی کشمکش کا شکار ہوئے کہ قانون سازی کا یہ ادھورا کام ابھی تک نامکمل ہے۔

نوآبادیاتی نظام قانون کو دیکھنے کے بالعموم دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ احساس کمتری کا شکار ہو کر اسے آخری آفاقی سچائی سمجھ کر قبول کر لیا جائے، دوسرا یہ کہ رد عمل کا شکار ہو کر اس کی کامل نفی کر دی جائے۔ لیکن ایک تیسرا راستہ بھی ہے اور وہ یہ کہ احساس کمتری، مرعوبیت یا رد عمل کا شکار ہوئے بغیر ٹھنڈے دل سے جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ نوآبادیاتی دور کے اس نظام قانون میں ہمارے لیے خیر کتنی ہے اور اس کا آزار کس قدر ہے۔ اس معروضی مطالعے کے بعد پھر یہ فیصلہ کرنا آسان ہو گا کہ اس میں کہاں اور کتنی اصلاح ضروری ہے۔

نظام کوئی بھی ہو، اس میں خوبی اور خامی کی گنجائش رہتی ہے۔ لیکن نوآبادیاتی نظام قانون کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس کی ساری خرابی اس کے بنیادی ڈھانچے میں ہے جو انسان کو شہری نہیں غلام اور رعایا سمجھتا ہے اور یوں اس سارے بندوبست کو اذیت میں بدل دیتا ہے۔ جب قانون

کا معاملہ ہی شہری کے بجائے رعیت اور نوکر سے ہے تو پھر عملاً کسی کے شخصی حقوق کا دفاع ہو پاتا ہے نہ ہی مالی حقوق کا۔ جب تک دور غلامی کا یہ ڈھانچہ موجود ہے، قوانین میں کسی بھی عنوان سے ہونے والی اصلاح اور رفوگری مجموعہ ہائے قوانین کا حجم تو بڑھا سکتی ہے، کسی معنوی تبدیلی کا پیش خیمہ نہیں بن سکتی۔

چوں کہ ہمارے آج بھی عملاً وہی نظام قانون ہے، جو برطانیہ نے بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد پورے ہندوستان میں، ایک قابض قوت کے طور پر، محکوم رعایا پر مسلط کیا تھا، اس لیے ہمیں اس نظام قانون کی مبادیات اور اس کے مقصود و مطلوب کو اس کے پورے سیاق و سباق کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جب ہم پر واضح ہو جائے کہ اس نظام قانون نے ہمیں کیا دیا تو ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا کہ اس نظام قانون کے ساتھ اب ہم نے کیا معاملہ کرنا ہے اور ہم نے آج بھی 'کمپنی بہادر' یا 'شاہ معظم' کی رعایا بن کر رہنا ہے یا قائداعظم کے آزاد پاکستان کا باوقار شہری بن کر۔

برادر مکرم ڈاکٹر محمد مشتاق احمد، اس سارے سفر میں، ایک دوست اور بھائی کے طور پر میری رہنمائی کرتے رہے۔ بہت اہم دستاویزات اور کتب کا حصول ان کی وجہ سے ممکن ہوا۔ مجھے رسمی طور پر نہیں بلکہ پوری معنویت کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرنا ہے۔

شیبانی فاؤنڈیشن اور اس کے روح رواں مراد علی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں۔ علم اور ذوق کی دنیا میں وہ ایک خوشگوار اضافہ ہیں۔ مارگلہ کے ایک گوشے میں ان ہی کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے یہ طے ہوا کہ اس موضوع پر کتاب لکھی جائے اور اس کی اشاعت بھی ان ہی کے

علمی ذوق کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ جس محنت سے انھوں نے کتاب پر کام کیا، یہ میرے لیے حیران کن بھی تھا اور میں نے اس سے سیکھا بھی بہت۔

سائرہ، عروہ، عائشہ اور علی نے بھی اس کتاب کے مختلف مراحل میں میری معاونت کی، میں ان کا بھی شکر گزار ہوں اور دعا گو بھی۔

یہ کتاب میں اپنے نانا چودھری ظہیر الدین گوندل مرحوم کے نام منسوب کرتا ہوں، مٹی، روایات، اقدار اور تہذیب سے محبت میں نے ان سے سیکھی۔

آصف محمود

اسلام آباد

یکم جنوری 2023ء

باب اول

نوآبادیاتی آزار: پس منظر

آزاد ہوئے عشروں بیت گئے لیکن ہمارے ہاں آج بھی وہ قوانین رائج ہیں جو برطانیہ نے ہمارے دور غلامی میں یہاں نافذ کیے تھے۔ ہمارا پورا فوجداری نظام اور قانون آج بھی اسی ڈھانچے پر کھڑا ہے جو برطانیہ نے 1857ء کی جنگ آزادی کو کچلنے کے بعد اس مقصد کے تحت یہاں متعارف کرایا تھا کہ آئندہ یہاں کسی کے سر اٹھانے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔ 17 کتوبر 1857ء صبح چار بجے بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان بدر کیا گیا اور 1860ء میں یہاں رعایا کے لیے ایک نیا قانون متعارف کرایا گیا۔ دور غلامی میں متعارف کرائے گئے اس قانون کو آج ہم مجموعہ تعزیرات پاکستان کہتے ہیں اور یہ ہمارے فوجداری نظام کی سب سے بنیادی اور اہم ترین دستاویز ہے۔

اس کے ایک سال بعد یعنی 1861ء میں یہاں پولیس کا ایک نیا نظام متعارف کرایا گیا۔ اسے پولیس ایکٹ، 1861ء کہا جاتا ہے اور عملاً آج بھی یہی قانون ہے جس کے تحت پولیس کام کر رہی ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے جب 1861ء میں رنگون میں قید کے دوران انتقال کیا تو ہندوستان میں محکوم رعایا کے لیے ایک نیا قانونی نظام مسلط کیا جا چکا تھا۔ پنجاب پولیس کی ویب سائٹ پر آج بھی یہ 'اعلان مسرت' موجود ہے کہ ہم وہی پولیس ہیں جس کی بنیاد 1861ء میں رکھی گئی۔

ضابطہ فوجداری ہمارے فوجداری نظام انصاف کی گویا شہ رگ ہے۔ یہ 1898ء میں نافذ کیا گیا اور آج تک اسی کے ذریعے معاملات چلائے جا رہے ہیں۔ مجموعہ ضابطہ فوجداری 161 سال پرانا ہے۔ فوجداری معاملات میں جو حیثیت ضابطہ فوجداری کی ہے دیوانی معاملات میں وہی حیثیت ضابطہ دیوانی کی ہے۔ یہ قانون 1908ء میں بنایا گیا۔

یہ قانونی بندوبست شہریوں کے لیے نہیں تھا۔ یہ غلام اور محکوم رعایا کے لیے تھا۔ اس کے بنیادی مقاصد میں کہیں اصلاح احوال یا انصاف نہ تھا، بنیادی ہدف یہ تھا کہ اس رعایا کو ایسے قانون کے ڈنڈے سے ہانکا جائے اور ایسی دلدل میں اتار دیا جائے کہ اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں اور آئندہ یہ کسی بغاوت کا تو کیا، سر اٹھانے کا بھی نہ سوچے۔

آج پاکستان میں نظام انصاف و قانون کا جو حال ہے وہ کسی تعارف یا تجزیے کا محتاج نہیں۔ اس کا تعلق بیان سے نہیں مشاہدے سے ہے۔ یہ وہ واردات ہے جو اس سماج پر بیت چکی ہے اور اس کی ایک ایک پور گھائل ہوئی پڑی ہے۔ اصلاح احوال کے لیے گاہے آوازیں بلند ہوتی ہیں اور دم توڑ دیتی ہیں۔ اس بنیادی نکتے کی طرف مگر کوئی نہیں آتا کہ جب تک ہم دور غلامی کے بعض قوانین اور ان کے نتیجے میں پروان چڑھنے والی ذہنیت سے نجات حاصل نہیں کرتے، اصلاح احوال ممکن ہی نہیں۔

یہ محض چند قوانین کا معاملہ نہیں۔ دور غلامی کے ان قوانین کی ایک طویل فہرست ہے جو آج بھی نافذ العمل ہیں۔ کسی بھی قانون کو محض اس کے قدیم ہونے کی بنیاد پر رد نہیں کیا جا سکتا، اگر وہ ایک اچھے قانون کی تعریف پر پورا اتر رہا ہو۔ یہی معاملہ نوآبادیاتی دور کے قوانین کا بھی ہے۔ ان قوانین کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے اس سارے سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تزویراتی پس منظر کو سامنے رکھا جائے جس میں یہ قانون سازی ہوئی۔ اس

سوچ اور اس فکر کو بھی جان لیا جائے جو اس قانون سازی کی محرک تھی۔ ان اہداف کو بھی دیکھ لیا جائے جو اس عمل میں مطلوب تھے۔

برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام میں قانون وانصاف کی دنیا میں ہمارے ساتھ کیا ہوا اور اس کی نوعیت کتنی سنگین ہے اس کا درست طور پر جائزہ لینا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم برطانوی راج کا عمومی مطالعہ کر کے یہ جان نہ لیں کہ برطانوی تسلط نے اس سماج کو، اس کی قدروں، اس کی تہذیب، اس کی تعلیم، اس کی ثقافت، اس کی معیشت اور اس کی نفسیات کو کیسے مجروح کیا اور ان پر کیا اثرات مرتب کیے۔ کیونکہ قانون کی دنیا میں جو کچھ ہوا، وہ اس واردات کا ایک جزو ہے، کل نہیں۔ کل کے ایک مختصر سے جائزے کے بعد جب ہم اس جزو کی طرف آئیں گے تو ہمارے لیے اس واردات کو پورے سیاق وسباق میں سمجھنا آسان ہوگا۔

یہ عمومی سماجی مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ انڈین پینل کوڈ یعنی موجودہ مجموعہ تعزیرات پاکستان کی تیاری کے ابتدائی مرحلے کی زمام کار بھی اسی شخص کے پاس تھی جو برصغیر میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کی سماجی، تعلیمی، ثقافتی پالیسی کا فکری معمار بھی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ صاحب تامس بے بنگٹن میکالے تھے، جنھیں ہم لارڈ میکالے کے نام سے جانتے ہیں۔ 1835ء کے انگلش ایجوکیشن ایکٹ کے بعد کی صورت حال میں، متحدہ ہندوستان میں تعلیمی پالیسی کی مبادیات بھی انھوں نے ہی طے کی تھیں اور 1833ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (جسے چارٹر ایکٹ بھی کہتے ہیں) کے بعد گورنر جنرل کونسل (کونسل آف انڈیا) کے پہلے ممبر برائے قانون بھی مقرر ہوئے اور 1834ء سے 1838ء تک سپریم کونسل کا حصہ رہے۔ یعنی جس وقت وہ اپنا تعلیمی میمورنڈم پیش کر رہے تھے اس وقت وہ قانون کے معاملات

بھی دیکھ رہے تھے۔ان کے پیش کردہ تعلیمی میمورنڈم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سفارشات اصل میں صرف تعلیم سے متعلق نہ تھیں بلکہ وہ ایک مکمل سماجی اور تہذیبی پیکج تھا۔ قانون اس مکمل اور ہمہ جہت واردات کا صرف ایک پہلو تھا۔

اس نئے سماجی، تعلیمی اور قانونی ڈھانچے کے معمار کی فکر متوازن اور معتدل نہیں، انتہا پسندانہ، متکبرانہ اور یک طرفہ تھی۔کارل مارکس نے انھیں تاریخ کا ایک منظم جعل ساز قرار دیتے ہوتے ان کے لیے "a systematic falsifier of history" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔[1]

یہاں مارکس کا حوالہ دینا اس لیے موزوں ہے کہ برطانوی محققین اور مورخین جب ہندوستان میں اپنے نو آبادیاتی نظام کی تحسین کرتے ہیں اور اسے برصغیر کے لیے ایک نعمت خیال کرتے ہیں تو مارکس کے موقف کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔مارکس نے لکھا تھا کہ ہندوستان میں برطانیہ کے تباہ کن اور جابرانہ اقدامات کو نظر انداز کر دینا چاہیے کیونکہ برطانیہ ہندوستان میں سماجی انقلاب لا رہا ہے۔

ان کا کہنا تھا، بے شک برطانیہ کی پالیسی بدترین اور احمقانہ ہے لیکن اس کی پالیسی کا بدتر اور احمقانہ ہونا سوال نہیں۔سوال یہ ہے کہ کیا ایشیا میں بنیادی انقلاب لائے بغیر یہاں کی سماجی صورت حال کو بدلا جا سکتا ہے؟ اور اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر قطع نظر اس بات کے کہ برطانیہ نے ہندوستان میں کیا جرائم کیے ہیں، یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ وہ یہاں انقلاب لانے میں تاریخ کے ایک

[1]کارل مارکس، *Das Capital*(نیویارک: دی ماڈرن لائبریری، 1906ء)، 877۔

لاشعوری عامل کا کردار ادا کر رہا ہے۔[2]

نوبل انعام یافتہ ماہر اقتصادیات امرتیا سین کے مطابق مارکس کی یہ رائے درست نہیں کہ برطانیہ کے مظالم سے اس وجہ سے صرف نظر کر لیا جائے کیونکہ اس نے ہندوستان میں انقلاب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔امرتیا سین کے مطابق مارکس کی اس رائے میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ استعماریت (Colonization) کو عالمگیریت (Globalization) سمجھ رہے ہیں جو درست نہیں ہے۔[3]

تاہم چوں کہ برطانوی نو آبادیاتی نظام کے دفاع میں مارکس کا یہ مضمون ایک بڑے حوالے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اس لیے یہ بات اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ اس نو آبادیاتی نظام کے فکری خدوخال متعین کرنے والی شخصیت کے بارے میں مارکس کے خیالات کیا تھے؟ یہی کہ ایک جھوٹا شخص جو تاریخ کو اپنے مفاد کے دائرے میں دیکھتا ہے اور جسے جھوٹ بولنے میں ملکہ حاصل ہے۔یعنی جب ہم نو آبادیاتی دور میں تشکیل پانے والی برصغیر کی فکر اور نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک ایسا شخص ہے جسے "a systematic falsifier of history" کہا جاتا ہے۔

لارڈ میکالے ان لوگوں میں سے تھے جو خواہش کو خبر بناتے ہیں۔چنانچہ جب انھوں نے پانچ جلدوں پر مشتمل تاریخ برطانیہ لکھی تو اس میں بھی خواہشات کو تاریخ بنا کر پیش کیا۔ناقدین کے نزدیک یہ تاریخ کم اور ڈرامہ زیادہ ہے۔ڈرامے کے لوازمات کے طور جس کے خیالات سے

[2]کارل مارکس، "The British Rule in India"، نیو یارک ڈیلی ٹری بیون، 25جون، 1853ء۔

[3]امرتیا سین، "Illusions of Empire"، دی گارڈین، 29جون، 2021ء۔

لارڈ صاحب کو اختلاف ہوا اسے ولن اور برائی کا پیکر بنا دیا اور جس سے اتفاق ہوا اسے ہیرو بنا دیا۔ تاریخ برطانیہ یہاں ہمارا موضوع نہیں البتہ یہ نکتہ اہم ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ، ان کے ماضی، ان کی ثقافت اور ان کے علمی ورثے کے ساتھ بھی میکالے صاحب نے کچھ ایسا ہی کیا۔

لارڈ میکالے نے جب ہندوستان میں تعلیم کے حوالے سے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک کو اپنا 36 نکاتی پروگرام پیش کیا تو گویا انھوں نے ایک بار پھر اپنے ناقدین کی تائید کر دی۔ ان کے خیالات بتاتے ہیں کہ وہ کتنے متعصب اور یک رخے انسان تھے اور ان کے نتائج فکر کس قدر ناقص تھے۔ لارڈ میکالے کا یہ میمورنڈم محض تعلیمی امور تک محدود نہ تھا بلکہ اس میں پورا ایک فلسفہ حیات تھا جو بتا رہا تھا کہ نو آبادیاتی نظام کے فیصلہ سازوں کی فکری گرہیں کتنی شدید ہیں۔ اس دستاویز میں وہ بتا رہے تھے کہ ہندوستان میں اردو، عربی اور سنسکرت وغیرہ کے بجائے صرف انگریزی میں تعلیم دی جانی چاہیے اور اس موقف کے حق میں وہ دلائل پیش کر رہے تھے۔

انھوں نے گورنر جنرل کو پیش کردہ اس پروگرام کے پیراگراف نمبر گیارہ (11) میں لکھا کہ اردو، سنسکرت اور عربی جیسی زبانوں کی کوئی حیثیت نہیں اور ان میں کبھی کوئی علمی کام نہیں ہوا۔ مشرقی لکھاریوں کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ انھوں نے صرف شاعری کی ہے اور عربی وغیرہ میں ہونے والی یہ شاعری بھی عظیم یورپی اقوام کی شاعری کے سامنے کچھ بھی نہیں۔

پیراگراف دس (10) میں وہ لکھتے ہیں کہ انھیں عربی زبان کا کوئی علم ہی نہیں ہے۔ وہ عربی جانتے ہی نہیں۔ لیکن اپنی جہالت کے اس اعتراف کے باوجود اسی پیراگراف میں وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو، عربی، فارسی، سنسکرت میں جتنا کچھ بھی لکھا گیا اس سب کی حیثیت ایک اچھی یورپی لائبریری کے ایک شیلف میں رکھی چند کتابوں سے بھی کم ہے۔

اس میمورنڈم کا پیراگراف چونتیس (34) بہت اہم ہے۔ اس میں وہ اپنے اس مقصد کو بیان کرتے ہیں جس کے حصول کے لیے وہ اردو، عربی، سنسکرت، فارسی وغیرہ کی مکمل نفی کرتے ہوئے انھیں ناکارہ زبانیں قرار دیتے ہیں۔ لارڈ میکالے لکھتے ہیں کہ ہمیں انگریزی زبان کے فروغ کے ذریعے ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہیے جو ہمارے اور ہماری لاکھوں کی رعایا کے درمیان رابطے اور ترجمانی کا کام کر سکے۔ ایک ایسا طبقہ جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن اپنے ذوق، اپنی فکر، اپنے اصولوں اور اپنے فہم کے اعتبار سے انگریز ہو۔ یہ اتنا اہم نکتہ ہے کہ یہاں لارڈ میکالے کے اصل الفاظ نقل کرنا مناسب ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "We must at present do our best to form a class who may be interpreters between us and the millions whom we govern, a class of persons, Indian in blood and colour, but English in tastes, in opinions, in morals and in intellect."[4]

نو آبادیاتی قوانین اور کلچر کے ساتھ لارڈ میکالے کا پیدا کردہ یہی طبقہ ہے جو آج بھی ہمارے سماج کے لیے اذیت اور امتحان بنا ہوا ہے۔ زبانیں ابلاغ کا ذریعہ ہوتی ہیں اور حصول علم کا بھی۔ انگریزی کی مادی افادیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ لیکن جب آپ دیگر زبانوں کو اس حقارت سے ٹھکرا دیں اور انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ آپ ایسے طبقے کے ظہور کی خواہش بھی کریں جو صرف انگریزی زبان ہی نہ بولتا ہو بلکہ جو اپنے ذوق، اپنی فکر، اپنے اصولوں اور اپنے فہم کے اعتبار سے انگریز ہو تو پھر یہ ایک علمی مشق نہیں رہتی، یہ ایک پوری تہذیبی واردات بن جاتی ہے۔ اسی کو استعماریت (Colonialism) کہتے ہیں۔

---

[4] لارڈ تھامس بینگٹن میکالے، *Minute on Indian Education* (انڈیا: نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، 1965ء)، 107-117۔

جب ہم نوآبادیاتی دور کے اس فکری معمار کے خیالات کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے یہ صاحب صرف متعصب ہی نہیں تھے یہ علمی بددیانتی کا ارتکاب بھی کر رہے تھے اور جہالت بھی ان کے دامن سے لپٹی تھی۔ اپنے اسی میمورنڈم کے پیراگراف پندرہ (15) میں وہ لکھتے ہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے ایام میں قدیم یونانی اور رومن علوم میں سے جو کچھ کارآمد تھا، وہ انگریزی میں ترجمہ کر لیا گیا اور اب باقی کسی زبان کی کوئی اہمیت نہیں۔ جو کچھ انسانیت کو درکار ہے، وہ انگریزی زبان میں ہے۔

لیکن لارڈ میکالے نے یہ نہیں بتایا کہ یورپ تک یونانی علوم کس زبان میں پہنچے تھے؟ کیا یورپ کے ماہرین نے ان علوم کے تراجم براہ راست ہی کر لیے تھے یا پہلے مسلمانوں نے ان علوم کے عربی تراجم کیے تھے اور یورپ ان عربی تراجم سے فیض یاب ہوا اور عربی میں لکھے ان نسخوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا؟ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں جو فکری اور علمی تراجم ہوئے وہ کہاں سے آئے تھے؟ یہ علم یورپ تک جس زبان میں پہنچا وہ یہی عربی تھی، جس کا کل علمی ذخیرہ اب لارڈ صاحب اپنے ایک شیلف سے کم درجے کا قرار دے رہے تھے۔

علم دنیا کا اجتماعی ورثہ ہے، کسی بھی زبان میں ہو۔ انگریزی زبان میں اس ضمن میں بلاشبہ اس دور میں بہت کام ہوا اور آج بھی اس زبان کی حیثیت مسلمہ ہے۔ تاہم اس کا انکار نہ مطلوب ہے نہ موضوع۔ یہاں جو چیز زیر بحث ہے، وہ یہ رویہ ہے جو اس نوآبادیاتی نظام کے پیچھے کھڑا تھا جس نے ہماری کمر دوہری کر رکھی ہے۔ اس رویے اور اس طرز عمل کو سمجھے بغیر ہم اس نوآبادیاتی نظام کی اس کرم فرمائی کو نہیں سمجھ سکتے جو قانون کی دنیا میں ہمارے ساتھ کی گئی۔ اس سیاق وسباق سے آگہی کی ایک افادیت یہ بھی ہے کہ یہ ہماری مرعوبیت اور احساس کمتری کی گرہیں کھولنے میں ایک عامل کا کردار ادا کر سکتی ہے۔

لارڈ میکالے کو شاید معلوم نہ ہو یا وہ ایک "a systematic falsifier of history" کے طور پر جان بوجھ کر غلط بیانی کر رہے ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ مستشرقین کے ہاں تو یہ اعتراف موجود ہے ہی، اب تو کسی اور کے لیے بھی اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں رہا کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں عربی زبان کا کردار اہم ترین اور بنیادی ہے۔

ایک عرصے تک یورپی اقوام اس غلط فہمی یا دانستہ ابہام کا شکار رہیں کہ رومن امپائر کے خاتمے کے بعد ایک تاریک دور شروع ہوا اور پھر اچانک یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے اس تاریکی میں علم و فضل کی شمع روشن کر دی اور سارا ماحول بدل گیا اور جہالت چھٹ گئی۔ حقیقت مگر اس سے مختلف ہے۔ یہ علمی تبدیلی راتوں رات برپا ہونے والا انقلاب نہیں تھا، یہ ایک طویل ارتقائی عمل تھا، جس میں مسلمانوں اور عربی زبان کا کردار بہت اہم تھا۔ حتی کہ اس علمی سفر میں ریاضی کی دنیا میں اس برصغیر کا کردار بھی غیر معمولی رہا جسے اب لارڈ میکالے صاحب تہذیب سکھانے آئے تھے کہ ان کی زبان تو کیا ان کے لہجے بھی ٹھیک نہیں، اس لیے انھیں مہذب ہونے کے لیے انگریزی سیکھنی چاہیے۔ آٹھویں صدی کے دوسرے نصف میں عباسی خلیفہ المنصور کے دور میں یونانی علوم کے تراجم پر کام ہوا۔ یہ ایک غیر معمولی کام تھا۔ ایک تہذیب جسے وجود کھوئے قریب دو صدیاں ہو چکی تھیں، اس تہذیب کے علم و فنون کا عربی میں ترجمہ کرنا آسان نہ تھا۔ عربوں نے مگر یہ کر دکھایا۔

پھر یہ مسلمانوں کا دور عروج تھا تو خود مسلمان اہل علم سائنس، طب، فلسفے اور دیگر علوم میں کام کر رہے تھے۔ یہی فکری کام بعد میں لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھانا شروع کیا گیا اور پھر یورپ میں اس سفر کی ابتدا ہوئی، جسے نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں قسطنطین الافریقی (Constantine the African) کا نام بطور مترجم بہت نمایاں

ہے، جنھوں نے طب کی دنیا میں مسلمانوں کی عربی میں لکھی متعدد کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا جو بعد میں یورپ میں پڑھایا جاتا رہا۔ چنانچہ اندلس میں مسلمانوں کا علمی ذخیرہ یورپ کے فکری ارتقا کا ایک بڑا عامل تصور کیا جاتا ہے۔[5] علمی دیانت کو یوں نظرانداز کیا گیا کہ اس سارے سفر میں عربی زبان اور مسلمانوں کے کردار کا ذکر نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ یورپی اہل علم نے مسلمانوں کی کتابیں نقل کر کے اپنے نام سے چھاپ لیں اور بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو فکری واردات کی گئی ہے اور اصل کام تو کسی اور کا ہے۔ نکولس کوپرنیکوس فلکیات اور ریاضی کا بہت بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ اسے مغربی تہذیب کا 'پہلا جدید سائنسدان' بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے جب یہ تصور دیا کہ نظام شمسی کا مرکز زمین نہیں بلکہ سورج ہے تو علم کی دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ یہ قدیم یونانی عقیدے کے برعکس تصور تھا۔ ایک عرصے تک یہ سب ان کے علم و فضل کا کمال سمجھا جاتا رہا مگر بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے فلکیاتی مشاہدے میں بنیادی تصورات معروف مسلمان سائنسدان جابر بن سنان البتانی کے تھے۔[6] بعد میں اپنے ایک اور علمی مقالے میں البتہ انھوں نے جابر بن سنان البتانی کی تحقیق کو بطور حوالہ پیش کیا۔ ایک یا دو بار نہیں، پورے تیئیس (23) بار اور صرف ایک مقالے میں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ البتانی کا مقام و مرتبہ کیا تھا۔[7]

[5] سلمیٰ خدرہ جایوسی، *The Legacy of Muslim Spain* (لائڈن: برل اکیڈمک پبلشرز 2005ء)، 910۔

[6] پرویز محمود، "Influence of the Islamic Golden Age on the European Renaissance"، فرائڈے ٹائمز، لاہور، 9 جولائی، 2021ء۔

[7] ایضاً۔

یہ جابر بن سنان البتانی ہی تھے، جنھوں نے پہلی بار فلکیات اور ریاضی کو اکٹھا کیا اور اسے ایک شعبہ تعلیم بنایا۔ انھوں نے ریاضی کے فارمولے فلکیات پر عائد کیے اور انھوں نے ہی یہ طے کیا کہ شمسی سال میں 365 دن ہوتے ہیں۔[8] یہ بھی البتانی ہی تھے جنھوں نے سورج کی حرکت سے معلوم کیا کہ بطلیموس کی تحقیق میں نقائص ہیں چنانچہ انھوں نے بطلیموس کے یونانی ورثے کو درست کیا۔ مثلثیات (Trigonometry) کے اصول بھی انھوں نے وضع کیے۔[9]

یورپ کے 'پہلے جدید سائنسدان' کوپرنیکوس کی فکری واردات کی کہانی یہاں تمام نہیں ہوتی۔ موصوف نے ایک اور عظیم سائنسی دریافت کی جس کے بارے میں اب دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ یہ تو اصل میں مسلمان سائنسدان نصیرالدین طوسی کا کام تھا۔ اب دنیا اسے "Tusi Couple" کے نام سے جانتی ہے اور یہ نصیرالدین طوسی سے منسوب ہے۔ یورپ کے 'پہلے جدید سائنسدان' نے طوسی کا سارا کام اٹھا لیا اور جہاں جہاں طوسی نے جیومیٹرک مقامات پر عربی میں کچھ لکھ رکھا تھا، وہاں 'جدید سائنسدان' نے بعینہٖ ان ہی مقامات پر اے، بی، سی اور ڈی کر دیا۔ آج مغرب کے اس عظیم سائنسدان کی علمی بددیانتی کے شواہد تو موجود ہیں البتہ اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ یہ جدید تحقیق ان کے اپنے نتائج فکر پر مبنی تھی۔ کوپرنیکوس نے 1496ء سے 1503ء تک کا وقت اٹلی میں گزارا اور اٹلی کی یونی ورسٹی آف پڈوا میں پڑھتے رہے۔ یہ وہ وقت ہے جب اسی یونی ورسٹی میں نصیرالدین طوسی کے کام کا یونانی اور لاطینی زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا اور کوپرنیکوس ان دونوں زبانوں کا علم رکھتا تھا۔ 'جدید سائنسدان' گویا ایک اچھا

[8] البتانی، "ابن الہیثم اور ابو کاملی، تین عظیم عرب ریاضی دان"، بی بی سی اردو، 15 مارچ، 2022ء۔

[9] ایضاً۔

مترجم تھا اور سرقہ کرنے پر اسے ملکہ حاصل تھا۔[10]

مغرب کے 'پہلے جدید سائنسدان' نے ایک اور مسلمان سائنسدان کا کام بھی چوری کیا اور حوالہ تک دینا مناسب نہ سمجھا۔ یہ موید الدین اردی العامری الدمشقی تھے۔ فلکیات پر ان کی دو کتابیں سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک کتاب الرسد اور دوسری کتاب الهیئة۔ کوپرنیکوس نے ریاضی کے جو اصول وضع کر کے داد وصول کی، بعد میں معلوم ہوا وہ موید الدین اردی العامری الدمشقی کا کام تھا۔[11] مغرب کے 'پہلے جدید سائنسدان' نے چاند کی حرکیات پر جو کام کیا یہ ابوالحسن علاءالدین (ابن الشاطر) کے کام کی مکمل نقل ہے۔ ابن الشاطر مسلمان ماہر فلکیات اور ریاضی دان تھے۔[12]

مغرب کا ایک اور بڑا ریاضی دان فیبو ناچی ہے جس نے وہاں اعداد متعارف کرائے۔ یعنی 1، 2، 3، 4 وغیرہ۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ جس مقامی تہذیب اور مقامی زبان کو لارڈ میکالے مکمل طور پر رد کرتے ہیں، فیبو ناچی کہتا ہے کہ اعداد اسی برصغیر کے لوگوں نے بنائے ہیں۔ اسی لیے انھیں "Indian Numerals" کہا گیا۔ اپنی کتاب *Book of Calculations* میں وہ 1 سے 9 تک کے اعداد لکھ کر کہتا ہے کہ یہ بھارتی اعداد ہیں۔ فیبو ناچی نے مگر یہ نہیں لکھا کہ اس نے سب کہاں سے پڑھا۔ خوارزمی کا نام تک لینا مناسب نہیں سمجھا۔ کتاب میں الجبرا پر انھوں نے جو تحقیق فرمائی اس میں سے 22 نکات خوارزمی کے اور 53

[10] پرویز محمود، "Influence of the Islamic Golden Age on the European Renaissance"۔

[11] ایضاً۔

[12] ایضاً۔

نکات ابو کامل الحاسب کے اٹھائے گئے تھے۔[13] ابو کامل کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ انھیں مصری کیلکولیٹر کہا جاتا ہے۔[14] خوارزمی نے ہی سب سے پہلے یہ بتایا تھا کہ آپ کسی بھی نمبر کو 10 آسان حروف سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ انھیں 'فادر آف الجبرا' بھی کہا جاتا ہے۔ سینٹ اینڈریوز یونی ورسٹی کے جان جوزف کے مطابق ایسے متعدد تصورات جنھیں سولھویں، سترھویں اور اٹھارویں صدی کے دوران یورپی ریاضی دانوں کی تحقیق سمجھا جاتا تھا، اصل میں عربی اور اسلامی ریاضی دان چار سو سال پہلے پیش کر چکے تھے۔ ان کے خیال میں جو ریاضی اس وقت ہم پڑھتے ہیں یہ یونانیوں سے زیادہ عربی یا اسلامی خدمات سے قریب ہے۔ یونی ورسٹی آف سرے کے پروفیسر جم خلیلی کا دعویٰ ہے کہ الگورتھم کے بغیر کمپیوٹر نہ ہوتے اور الکلی کے بغیر کیمسٹری نہ ہوتی۔[15]

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق ہندوستان کی قدیم ترین ریاضی کی دستاویزات ضلع مردان، خیبر پختون خوا کے گاؤں بخشالی سے دریافت ہوئی ہیں۔[16]

قسطنطین الافریقی نے، جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا، 70 سے زائد عربی کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ ان تراجم میں کئی ایسے ہیں، جو اس نے خود سے منسوب کر لیے۔ علی بن موسیٰ مجوسی کی کتاب کامل الصناعة الطبية کو دو سو سال تک قسطنطین صاحب ہی کی علمی کاوش سمجھا جاتا رہا اور دو صدیوں کے بعد جب اصل کتاب کا ترجمہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو علی بن

[13] ایضاً۔

[14] ایضاً۔

[15] البتانی، ابن الہیثم، بی بی سی اردو۔

[16] کم پلوفکر، "Indian Mathematics"، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

موسیٰ مجوسی کی کتاب تھی۔[17] یورپ پر جدید طب کے دروازے ان ہی تراجم نے کھولے جو قسطنطین نے اپنے نام سے شائع کیے تھے اور بعد میں جن کی حقیقت واضح ہو گئی کہ یہ تو مسلمانوں کی تصانیف تھیں۔

میگنس البرٹس کو یورپ کی 'تحریک احیا' کے زمانے میں بہت سے علوم کا بانی سمجھا جاتا ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس کا انحصار یونانی ماخذ پر رہا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے ماخذ یونانی نہیں تھے بلکہ اس نے یہ مواد ابن سینا، ابن رشد اور جابر بن حیان کی کتابوں سے اخذ کیا تھا۔ کیونکہ اب یہ بات یقین کے درجے میں داخل ہو چکی ہے کہ وہ یونانی زبان سے ناواقف تھا۔[18]

مائیکل سکاٹ نے فلکیات پر نور الدین البطروجی کی کتاب کا ترجمہ کیا اور اسے نکولاؤس سے منسوب کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو سرقہ کیا گیا تھا۔[19]

ابن سینا کی کتاب الاحجار ارسطو سے منسوب کر دی گئی۔ آنکھ کے بارے میں حنین بن اسحاق کی کتاب جالینوس سے اور اسحاق بن عمران کی مالیخولیا پر لکھی گئی کتاب روفوس یونانی سے منسوب کر دی گئی۔ رائمنڈ لولوس کی بیس کتابیں بعد میں ثابت ہوا کہ ان کی اپنی لکھی ہوئی نہیں بلکہ عربی تراجم ہیں۔[20]

---

17 فواد سیزگین، تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام، ترجمہ: خورشید رضوی، (اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، 2005ء)، 149۔

18 ایضاً، 151۔

19 ایضاً، 152۔

20 ایضاً۔

دیگر تہذیبوں اور زبانوں کے بارے میں لارڈ میکالے کے خیالات اپنی جگہ، حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں عربی سے کیے گئے تراجم کا اہم کردار ہے۔ ارسطو کا فلسفہ یورپ تک کیسے پہنچا؟ ان ہی عربی تراجم کے ذریعے۔ یہ جو آج جدید تعلیمی اداروں میں 'ڈاکٹر' بنتے ہیں انھیں شاید معلوم ہی نہ ہو کہ یہ عربی سے لاطینی ترجمے کا اعجاز ہے اور اجازت التدریس یعنی پڑھانے کی اجازت کا جب لاطینی میں ترجمہ ہوا تو "Licentia Docendi" ہو گیا۔ اب اسے ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔

یہی معاملہ یورپ کے ہیومن ازم کا ہے، اس میں "Ars Dictaminis" کی لاطینی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، یعنی "Art of Dictation"۔ یہ اصطلاح عربی کے لفظ 'املاء' کا لاطینی ترجمہ ہے کیونکہ عرب اہل فکر و دانش کے ہاں ساتویں صدی میں علوم کی املا کرانے کا رواج تھا۔

نشاۃ ثانیہ میں "Studia Humanities" کی اصطلاح تو استعمال کی جاتی رہی لیکن یہ شاید لارڈ میکالے کو علم ہی نہ ہو کہ یہ عربی کے علوم الآداب کا لاطینی ترجمہ ہے اور ہیومن ازم پر یورپ میں پڑھایا جانے والا سارا ابتدائی کام عربی سے تراجم کی شکل میں لیا گیا تھا۔

یہ ایک طویل فہرست ہے جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔ صرف سیاق و سباق واضح کرنے کے لیے یہ چند حوالے دینا پڑے ہیں۔ اس مشق کا مقصد کسی ایک پر کسی دوسرے کی برتری ثابت کرنا نہیں بلکہ مطلوب صرف یہ ہے کہ سند رہے اور نو آبادیاتی دور کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساس کمتری اور مرعوبیت کے آسیب سے نجات حاصل کرنے میں معاون اور مددگار ثابت ہو۔

یورپ نے اس سارے علمی سفر کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اسی کی تہذیب علم وفکر کی تہذیب ہے اور باقی سب جاہل ہیں اور انگریزی کے علاوہ ہر زبان فرسودہ ہے۔ یہی وہ فکری غلط فہمی یا بددیانتی ہے جو پھر یہ اعلان کرتی ہے کہ عربی اور مشرقی زبانوں میں لکھی گئی تمام کتب یورپ کی ایک اچھی لائبریری کے ایک شیلف میں رکھی چند کتابوں سے بھی حقیر ہیں۔

لارڈ میکالے کے اس میمورنڈم میں ایک اور اہم نکتہ بھی اٹھایا گیا ہے جو ہمیں اس نو آبادیاتی نظام کی نفسیاتی گرہ کی بھی خبر دیتا ہے۔ برصغیر میں نئے مجوزہ تعلیمی نظام کے لیے درکار فنڈز کے حوالے سے رائے دیتے ہوئے لارڈ میکالے نے پیرا گراف چھ (6) میں لکھا کہ ریاست میسور میں شیروں کے شکار پر جو انعامی رقم مقرر کی گئی ہے اسے کم کیا جائے۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے اور نوآبادیاتی نظام کی نفسیات سے آگہی کے لیے اس نکتے کو سمجھنا ضروری ہے۔

میسور میں شیروں کے شکار پر یہ انعامی رقم ظاہر ہے کہ خاصی بھاری نہیں تو نہایت معقول ضرور ہوگی ورنہ لارڈ میکالے اسے اتنی اہمیت نہ دیتے۔ اگر میکالے اسے کم کرنے کا کہہ رہے تھے تو اس کا مطلب ہے یہ معمولی رقم نہ تھی۔ سوال یہ ہے کہ شیروں کے شکار کی کیا ضرورت تھی اور اس پر اتنی انعامی رقم کیوں مختص کی گئی؟ جم کاربٹ جیسے لوگ ہمیں بتاتے ہیں کہ اصل میں یہ آدم خور شیر تھے جنھیں قتل کیا جاتا رہا اور ایک شیر تو ایسا تھا جو اکیلا ہی 400 لوگوں کو کھا چکا تھا۔ جم کاربٹ نے اس پر متعدد کتابیں لکھیں اور ان کی فروخت نے ریکارڈ قائم کیے۔ ان کی کتاب *Man*

Eater of Kumaon کی فروخت چالیس لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔[21]

آدم خور شیروں والی یہ بات اپنی جگہ درست بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں لارڈ میکالے نے پورے ہندوستان میں ہونے والے شکار کا ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے جس انعامی رقم کا ذکر کیا اس کا تعلق بھی سارے برصغیر سے نہیں تھا۔ یہاں تو وہ صرف میسور کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ شیروں کے شکار اور اس کے لیے انعامی رقم کا میسور سے ایسا کیا خاص تعلق ہے کہ اس کا ذکر لارڈ صاحب کو اس اہتمام سے کرنا پڑا؟

یونی ورسٹی آف اوویلونائے کے ایسوسی ایٹ پروفیسر اور مؤرخ ڈاکٹر جوزف سرامک کے مطابق اس کی وجہ انگریزوں کی ٹیپو سلطان سے شدید نفرت تھی۔ وہ ٹیپو سلطان کی مزاحمت کی وجہ سے انھیں ایک گستاخ اور متکبر حکمران سمجھتے تھے اور چوں کہ شیر کی علامت کو ٹیپو سلطان سے نسبت تھی اس لیے انگریزوں نے اس نسبت کو بے رحمی سے کچلا۔ ایسا کر کے وہ اصل میں ٹیپو سلطان کی تذلیل کر رہے ہوتے تھے۔[22] کیٹ برٹل بینک کے مطابق انگریز مقامی حکمرانوں پر ہر لحاظ سے حاوی ہونا چاہتے تھے اور چوں کہ شیر کی علامت ٹیپو سلطان سے جڑی ہوئی

---

21 مارٹن بوتھ، *Carpet Sahib: A Life of Jim Corbett* (نیویارک: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، 1986ء)، 230۔

22 جوزف سرامک، "Face Him Like a Briton: Tiger Hunting, Imperialism and British Masculinity in Colonial India, 1800-1875"، وکٹورین اسٹڈیز، 48:4 (سمر 2006ء)، 659۔

تھی تو انگریز اس معاملے میں جنون کی حد تک پہنچ چکے تھے۔[23]

برطانوی مؤرخ میلڈرڈ آرچر لکھتی ہیں کہ ٹیپو سلطان کے پاس ایک شیر کا مجسمہ تھا، جس میں شیر نے ایک انگریز فوجی کو گرایا ہوا تھا۔ یہ شیر ٹیپو کو ایک فرانسیسی کاریگر نے 1794ء میں تحفے میں دیا تھا۔[24]

ڈاکٹر جوزف سرامک کے مطابق ٹیپو سلطان کو مارنے کے بعد شیروں کے اس بے رحمی سے شکار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریز کے نزدیک شیر کے معنی تھوڑے مختلف ہو چکے تھے۔ شیر ٹیپو سلطان کے دبدبے کی علامت تھا۔ اور انگریز اندھے نہیں تھے کہ اس کے یہ معنی نہ سمجھتے۔ شیر انگریزوں پر ٹیپو سلطان کی فتح کی علامت تھی۔ اس علامت کی تذلیل کر کے اور اس کا شکار کر کے وہ گویا یہ پیغام دے رہے تھے کہ ٹیپو سلطان پر ہم فتح پا چکے ہیں۔[25] ایک اور وجہ جوزف سرامک کے خیال میں یہ تھی کہ یہ مقامی لوگوں کو بتایا جا رہا تھا کہ تمہارے جنگلات کے مالک اور حاکم ہم ہیں۔ ٹیپو سلطان مارے جا چکے ہیں اور اب ہمارا راج ہے۔ تمہارے جنگلات اور ماحولیات سب ہماری کالونی ہیں۔

ٹیپو سلطان شیروں کے دلدادہ تھے۔ انھیں شیر میسور بھی کہا جاتا تھا۔ 'ٹیپو' سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے 'شیر جیسا'۔ ان کی تلواروں اور خنجر پر بھی شیر کی شکل بنی ہوتی تھی۔ شیر ہی ان کی سلطنت کا سرکاری نشان تھا اور ان کے لیے جو تخت بنایا تھا وہ بھی ایسا تھا جیسے

[23] بریل بیک کیٹ، *Tipu Sultan's Search for Legitimacy: Islam and Kingship in a Hindu Domain* (دہلی: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، 1997ء)، 140۔

[24] میلڈرڈ آرچر، *Tippoo's Tiger* (لندن: ایچ ایم اسٹیشنری آفس، 1959ء)، 27۔

[25] جوزف سرامک، *Face Him a Like Briton*، 661۔

کوئی شیر کے اوپر بیٹھا ہوا ہو۔ ٹیپو سلطان نے فرانسیسی معماروں سے ایک مجسمہ بنوایا تھا جس میں ایک شیر ایک انگریز سپاہی کو گرائے ہوئے ہے۔ یہ مجسمہ آج بھی وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم میں رکھا ہے۔ میلڈرڈ آرچر کے مطابق تو شروع میں یہ تجویز دی گئی تھی کہ اس مجسمے کو ٹاور آف لندن میں رکھا جائے۔[26]

ٹیپو سلطان کو شکست دینے کے بعد انگریز نے ان کو "Outdo" کرنے کے لیے شیروں کا اس بے رحمی سے شکار کیا کہ جہاں لاکھوں شیر پائے جاتے تھے وہ برطانوی راج کے اختتام پر محض چند ہزار رہ گئے۔ وحشت کے اس سارے کھیل میں شیر میسور کی تذلیل مقصود تھی۔ چنانچہ ٹیپو سلطان کے میسور میں ہی وین انجن اینڈ وین انجن نامی ایک فرم قائم کی گئی جو شیروں کو حنوط کرتی اور کھال میں بھوسہ بھر کے جانوروں کے ماڈل تیار کرتی۔ یہ کام کہیں اور بھی ہو سکتا تھا۔ میسور سے بڑے شہر بھی موجود تھے جہاں کی مارکیٹ کے امکانات میسور سے کہیں زیادہ تھے لیکن چوں کہ مقصد ٹیپو سلطان کی نسبت کی تذلیل تھی، اس لیے یہ فرم میسور میں قائم کی گئی۔ میسور میں وحشت کا یہ کھیل کتنی شدت سے کھیلا گیا اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ صرف اس ایک فرم نے 43 ہزار شیروں اور 30 ہزار تیندووں کی کھال کو محفوظ (Process) کیا۔ جس شہر میں شیر میسور سلطان ٹیپو کی یادیں بسیرا کیے ہوئے تھیں، اس میسور کے بازاروں اور چوراہوں میں شیروں کی کھالوں کو خشک کیا جاتا۔ ہندوستان بھر سے شیر مار کر ان کی کھال میسور بھجوائی جاتی۔

[26] میلڈرڈ آرچر، *Tipoo's Tiger*، 22۔

آپ اندازہ کریں کہ ٹیپو 1799ء میں شہید ہوئے اور لارڈ میکالے 1835ء میں کہہ رہے ہیں کہ بہت خرچہ ہو رہا ہے اس لیے اب میسور میں شیروں کے شکار پر مختص انعامی رقم کم کر دی جائے۔ گویا چار دہائیاں ہونے کو آ رہی تھیں لیکن جذبہ انتقام ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔ ٹیپو سلطان سے جڑی اس نسبت کا قتل عام بھی جاری تھا اور اس پر انعام بھی اور لارڈ صاحب اب بھی یہ سلسلہ ختم کرنے کا نہیں کہہ رہے تھے بلکہ ان کا مطالبہ صرف اتنا تھا کہ اس انعامی رقم کو ذرا کم کر دیا جائے۔ یہ وہ نفسیات تھی جو برصغیر میں رعایا کے لیے قانون سازی کرنے جا رہی تھی۔

بعد میں برطانوی دور میں ہی برصغیر میں شیروں کے شکار کو رومانوی رنگ دیا گیا۔ جم کاربٹ جیسے شکاری نے ہندوستان میں شیروں کے شکار پر درجن بھر کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان کی اکثر کتابیں آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس نے شائع کیں۔ یہی نہیں، ہالی وڈ نے یہاں فلمیں بنانا شروع کر دیں۔ "Tiger's Claw" اور "Between Savage and the Tiger" جیسی فلمیں بننے لگیں جو ہالی وڈ میں سپر ہٹ ثابت ہوئیں۔ شیر بے چارے اپنے قتل عام کے لیے یوں دستیاب تھے کہ فلموں کی شوٹنگ کے لیے اصل شکار کی سہولت دستیاب ہوا کرتی تھی۔ ہالی وڈ کے پروڈیوسر یہاں تشریف لاتے، ہاتھیوں پر کیمرے نصب ہو جاتے اور 'مہذب' لوگوں کی تفریح کی خاطر شیروں کا قتل عام شروع ہو جاتا۔

ایک فلم "The Man Eater" کی شوٹنگ کے لیے آٹھ شیر صرف اس لیے مارے گئے کہ پروڈیوسر صاحبان شکار کی فلم بندی کے مناظر سے مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ ان کے اطمینان کی خاطر یکے بعد دیگرے آٹھ شیروں کا شکار کیا گیا۔ ایلس ڈنگن جیسے فلم ڈائریکٹرز کی

شیروں کے شکار کی ویڈیوز آج بھی یوٹیوب پر دیکھی جا سکتی ہیں، جو فلموں کی شوٹنگ پر آتے اور جی بھر کر جانوروں کا قتل عام کرتے۔

ڈیوک آف کناٹ کی ویڈیو بھی موجود ہے، جس میں وہ ہاتھیوں کے قافلے اور پیادہ دستوں کے ساتھ شیروں کا شکار کرتے ہیں۔ ہرفرڈ کولنگ نامی ایک امریکی فوٹو گرافر یہاں آیا اور صرف فوٹو گرافی کا شوق پورا کرنے کے لیے شیر مارتا رہا۔ دسمبر 1924ء کے امیرکن سینما ٹوگرافر کے شمارے کے مطابق اس نے سات (7) شیروں کا شکار کیا۔ مقامی وائلڈ لائف کو یوں برباد کیا گیا کہ بادشاہ سلامت، وائسرائے اور ڈپٹی کمشنر صاحبان ہی نہیں فلموں کے پروڈیوسر اور فوٹو گرافر بھی یہاں آ کر جنگلی حیات کا قتل عام کرتے رہے۔

ولیم رائس اور جم کاربٹ جیسے شکاریوں نے اپنی کتابوں کے عنوان یوں باندھے کہ کماون کا آدم خور، مندر کا خون خوار چیتا، کماون کے مزید آدم خور، اترکھنڈ کا آدم خور شیر، ردرا پریاگ کا آدم خور چیتا۔ ان کتابوں سے یہ تاثر دیا گیا کہ انگریز شکاری تو جیسے مسیحا بن کر آئے اور انھوں نے لوگوں کو آدم خوروں سے نجات دلائی۔ ان زمانوں کی لکھی کتابوں کے تراجم ہمارے سکولوں کی لائبریریوں میں آج بھی مل جاتے ہیں۔ میں نے بھی زمانہ طالب علمی میں ایسی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ سندربن کا آدم خور، آگرہ کا آدم خور، اترپردیش کا آدم خور، کشمیر کا خونی چیتا وغیرہ۔ ان کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو شیر اور چیتے اس وقت مارے گئے جب جنگلوں میں ریل کی پٹری بچھائی جا رہی تھی اور یہ حملہ آور ہو جاتے تھے یا پھر آدم خور شیر اور تیندووں کا شکار کیا جاتا، تاکہ آبادی محفوظ رہے۔ جوزف سرامک اس نکتہ نظر سے متفق نہیں۔ ان کا کہنا ہے

کہ شہریوں کی حفاظت کے لیے چند ہی شیر مارے گئے ہوں گے۔ زیادہ تر شکار کی وجوہات کچھ اور تھیں۔

برطانیہ کے شہر ایگزیٹر کے 153 سال پرانے رائل البرٹ میوزیم اینڈ آرٹ گیلری میں جو بنگالی شیر حنوط کر کے رکھا ہوا ہے وہ کہاں سے آیا تھا؟ یہ شیر اس میوزیم کو کسی غیر مہذب ہندوستانی شکاری سے ضبط کر کے نہیں دیا گیا تھا بلکہ یہ تحفہ جناب کنگ جارج پنجم کی جانب سے میوزیم کو پیش کیا گیا تھا اور یہ شیر ان 39 شیروں میں سے ایک تھا جنھیں بادشاہ سلامت کی سرپرستی میں مسلسل دس دن جاری رہنے والی شکاری مہم کے دوران مارا گیا۔ پہلا شیر بادشاہ سلامت نے مارا اور پھر 600 ہاتھیوں پر مشتمل اس قافلے کے شکاریوں کے ہاتھوں شیروں سے ہرن اور تیندووں تک کسی شے کو امان نہ تھی۔ جو شیر بادشاہ سلامت کے ہاتھوں مارا گیا وہی اب رائل البرٹ میوزیم میں رکھا ہے۔ تو کیا بادشاہ سلامت مقامی آبادی کو شیروں سے بچانے کے لیے خصوصی طور تشریف لائے تھے تاکہ وہ ان شیروں کا شکار کر کے اپنی رعایا کو ان آدم خوروں سے محفوظ کر دیں؟

اشوکا یونی ورسٹی کے ماحولیات کے پروفیسر مہیش رانگراجن نے اپنی کتاب *Indian Wildlife History* میں دعویٰ کیا ہے کہ 1875ء سے لے کر 1925ء کے دوران برطانوی فوجی افسران اور شکاریوں کے ہاتھوں ہندوستان میں 80ہزار شیروں کا شکار ہوا۔ اس دعوے کی بی بی سی بھی تائید کرتی ہے، اگرچہ وہ اس کی تاویل کرتی ہے۔[27] آج برصغیر کے اس پورے خطے

27 سوتک بسواس، "India's Tiger Killing: A Success Story gone Wrong"، بی بی سی، 6نومبر 2018ء۔

میں چند ہزار شیر رہ گئے ہیں۔ شیروں کی یہ ساری نسل اس دور میں ماری گئی جب برصغیر پر مہذب لوگوں کی حکومت تھی اور وہ اہتمام سے شیروں اور تیندووں کا شکار کیا کرتے تھے۔

ایڈ ورڈ پرچرڈ گی نے بھی *The Wildlife of India* میں لکھا ہے کہ بیسویں صدی کے شروع میں بھی یہاں مقامی شیروں کی تعداد 40ہزار کے قریب تھی (یعنی 1900ء تک 60ہزار شیر مارے جا چکے تھے) جو بعد میں چند ہزار تک رہ گئی۔ یاد رہے *The Wildlife of India* کا دیباچہ جواہر لعل نہرو نے لکھا تھا۔

شیروں کا جس بے رحمی سے قتل عام ہوا، وہ معلوم انسانی تاریخ کا افسوسناک باب ہے۔ نہ صرف برطانوی افسران نے چن چن کر شیروں کو مارا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ ایک شیر مارنے والے کو دس روپے انعام دیا جائے گا۔ لارڈ اینڈ لیڈی کرزن کی مردہ شیروں کے ساتھ فخر سے بنوائی گئی تصاویر آج بھی برطانوی میوزیم کی زینت ہیں۔ یہ سب کس لیے ہو رہا تھا؟ ٹیپو سلطان سے جڑی نسبت کی تذلیل کے لیے۔ مکرر عرض ہے کہ یہ وہ سوچ تھی جو اس نوآبادیاتی نظام میں فیصلہ ساز تھی جو برصغیر میں ہمارے، یعنی رعایا کے لیے ایک نیا قانون وضع کر رہا تھا۔

برصغیر کی سماجی قدروں سے لے کر اس کی معیشت تک اور معاشرتی ڈھانچے سے لے کر اس کی نفسیات تک، ہر چیز کو ادھیڑ کر رکھ دیا گیا۔ ایک نئی زبان صرف متعارف نہیں کرائی گئی، غیر فطری طریقے سے مسلط بھی کی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر کا تعلیم یافتہ طبقہ کھڑے کھڑے ناخواندہ ہو گیا۔ برصغیر کا معاشی استحصال ہوا۔ اس کے وسائل کو لوٹا گیا۔ اس کی نفسیات تباہ کر دی گئیں۔ ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جو شعوری طور پر اپنے ماضی کے ہر نقش پر شرمندہ تھا۔ اسی طبقے کی

سرپرستی کی گئی۔ چنانچہ برطانوی سامراج کا مارکس جیسا مداح بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ برطانیہ نے ہندوستان کے سماج کے پورے ڈھانچے کو تباہ کر دیا ہے اور تعمیر نو کی کوئی علامت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔[28]

برطانوی ماہر اقتصادیات اینگس میڈے سن کے مطابق 1820ء میں برصغیر کی معاشی قوت کا یہ عالم تھا کہ اس کی جی ڈی پی دنیا کی جی ڈی پی کا 16 فیصد تھی لیکن 1940ء کی دہائی میں یہ شرح سمٹ کر صرف 4 فیصد رہ گئی تھی۔[29]

ہارورڈ یونی ورسٹی کے ماہر اقتصادیات پروفیسر جیفری گیل ولیم سن کے مطابق جب برصغیر برطانوی سامراج کے زیر تسلط آیا تو اس کی اس کی جی ڈی پی کی شرح دنیا کی مجموعی جی ڈی پی کا 25 سے 35 فیصد ہوتا تھا لیکن 1947ء میں جب برطانیہ یہاں سے نکلا تو یہ جی ڈی پی صرف 2 فیصد رہ چکی تھی۔[30] ویوک سنیجا کے مطابق سترویں صدی کے ہندوستان کی فی کس آمدنی سترویں صدی کے یورپ سے زیادہ تھی۔[31]

[28] کارل مارکس، "The British Role in India"، نیو یارک ڈیلی ٹریبون، 1853ء۔

[29] اینگس میڈے سن، *The World Economy: Historical Statistics* (پیرس: او ای سی ڈی ڈولپمنٹ سنٹر، 2003ء)، 379۔

[30] جیفری ولیم سن، *India's Deindustrialization in the 18th and 19th Centuries* (امریکا: ہارورڈ یونی ورسٹی پریس، 2005ء)، 9۔

[31] ویوک سنیجا، *Understanding Business: A Multidimensional Approach to the Market Economy* (لندن: روٹلیج پبلشرز: 2002ء)، 13۔

پارتھا سارتھی نے لکھا کہ اٹھارویں صدی میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی ریاست میسور میں ملازمین کو ملنے والے معاوضے برطانیہ میں ملازمین کو ملنے والے معاوضوں سے زیادہ تھے۔[32]

ریلوے اور نہری نظام جیسی چند چیزوں کی بنیاد پر برطانوی نوآبادیاتی نظام کے فضائل بیان کرنے والوں کے دلائل میں بعض ضمنی سچائیاں ہو سکتی ہیں لیکن عمومی صورت حال یہی تھی کہ برطانیہ نے اس علاقے کو ایک مقبوضہ علاقہ، اس کے باشندوں کو مفتوح رعایا اور اس کے وسائل کو مال غنیمت سمجھا۔

یہاں کی مقامی صنعت و حرفت کو تباہ کیا گیا۔ ایک شعوری اہتمام کیا گیا کہ یہ علاقہ خام مال کی پیداوار کے سوا کسی قابل نہ رہے۔ یہاں کی کاٹن انڈسٹری قانون سازی اور اہتمام سے تباہ کی گئی۔ بنگال جیسے امیر صوبے کو یوں لوٹا گیا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس معاشی واردات کے حجم کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ استا پتنائک کے مطابق 1765ء سے 1938ء تک برطانیہ نے برصغیر سے جو دولت نکالی اس کا حجم 45 ٹریلین ڈالر تھا۔ یہ رقم آج کے برطانیہ کے جی ڈی پی سے 17 گنا زیادہ ہے۔[33]

اس نوآبادیاتی نظام میں کچھ ایسا انفراسٹرکچر البتہ ضرور کھڑا کیا گیا جس کا بعد میں پاکستان اور ہندوستان دونوں کو فائدہ ہوا۔ جیسے ریلوے اور نہری نظام۔ لیکن یہاں بھی یہ نکتہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہاں بھی مطلوب و مقصود کچھ اور تھا۔ مثلاً ریلوے کے ذریعے ہندوستان کا خام مال تیزی

[32] پارتھا سارتھی، *Why Europe Grew Rich and Asia Did Not: Global Economic Divergence, 1600-1850* (نیویارک: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، 2011ء)، 39۔

[33] جیسن ہیکل، "How Britain Stole 45 Trillion Dollars from India"، الجزیرہ، 19 دسمبر، 2018ء۔

سے یہاں سے نکال کر برطانیہ پہنچانا مقصود تھا اور نہری نظام کے پیچھے مقامی زراعت کی بہتری مقصود تھی اور اس کی اپنی الگ وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ ریلوے کا سارا انفراسٹرکچر یہیں سے اکٹھے کیے گئے پیسے سے کھڑا ہوا، زراعت جتنی بہتر ہوتی اتنا ہی ٹیکس اکٹھا کیا جاتا اور اتنا ہی خام مال مہیا کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ جنگوں میں ضرورت کے لیے جو گھوڑے آسٹریلیا سے منگوائے جاتے تھے ان کا حصول گھوڑے پال سکیم شروع کر کے یہیں سے یقینی بنایا جانے لگا۔ جن میں جاگیریں تقسیم کی گئیں وہ بھی بندہ بے دام بن کر خدمت بجالاتے رہے۔ ہاں نوآبادیاتی نظام کے خاتمے پر یہ نہری نظام اور یہ ریلوے بہر حال ہمارے کام آئے لیکن ساتھ ہی وہ جاگیردار بھی ورثے میں آئے جنھیں برصغیر کی تاریخ میں پہلی بار مستقل بنیادوں پر جاگیریں عطا کر کے 'معززین' بنایا گیا اور جن کے آسیب سے آج تک سماج آزاد نہیں ہو پا رہا۔

یہی صورت حال قانون کی دنیا میں ہمارے سامنے ہے۔ نوآبادیاتی دور کا بنا قانون اگرچہ آج بھی ہمارے ہاں رائج ہے اور ہم اسے بھی اس نوآبادیاتی نظام کے فوائد کے باب میں درج کر سکتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس قانون کے نفاذ کا جو اصل مقصد تھا اس کے بوجھ تلے یہ پورا سماج کچلا جا چکا ہے۔ یہ جو اصل مقصد ہے اس کی اہمیت صرف قانون میں نہیں، ہر معاملے میں ہوتی ہے۔ اور کسی بھی چیز کو درست طور پر تب ہی سمجھا جا سکتا ہے جب اسے اس کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے۔

برطانوی مؤرخین، محققین اور اشرافیہ میں سفید فام برتری کا احساس تکلیف دہ حد تک نمایاں تھا۔ ان کے ہاں یہ تصور عام تھا کہ یورپ کے لوگوں کا یہ فرض ہے کہ غیر سفید فام اقوام کو

تہذیب سکھائیں۔[34] ان کے خیال میں دنیا کی مہذب ترین قوم سفید فام تھے اور ان کے علاوہ ساری اقوام جاہل اور کم عقل تھیں۔ چنانچہ اب یہ سفید فام لوگوں پر فرض تھا کہ وہ باقی اقوام کو بھی جہالت سے نکالیں۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام اسی 'حیاتیاتی نسل پرستی' کے تصور پر کھڑا تھا جسے اب خود یورپ ٹھکرا چکا ہے لیکن ہمارے لاشعور سے یہ بات ابھی تک نہیں نکل پا رہی۔

یہی تصور رڈیارڈ کپلنگ کے ہاں بھی ملتا ہے۔ حیاتیاتی نسل پرستی کے علم بردار مغربی اہل فکر کی فہرست طویل ہے مگر رڈیارڈ کپلنگ اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ بمبئی میں پیدا ہوئے تھے اور پہلے انگریز ادیب تھے جنھیں نوبل انعام دیا گیا۔ ان کی نظم "The White Man's Burden" اس زعم برتری کا ایک واضح نمونہ ہے۔ اس نظم کا تعلق اگرچہ امریکی سامراجی بندوبست سے ہے لیکن یہ بنیادی طور پر برطانوی ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ سفید فام نسل کا یہ فرض ہے کہ غیر سفید فام اقوام کو تہذیب سکھائے اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے سفید فاموں پر لازم ہے کہ وہ دیگر اقوام کو اپنا محکوم بنا کر وہاں سامراجیت قائم کرلے۔[35] یعنی یہ خدا کی طرف سے سفید فام قوموں پر ایک اخلاقی فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ دیگر اقوام کو اپنی کالونی بنالیں اور اس کے نتیجے میں انھیں مہذب کر دیں۔ اس میں چوں کہ برطانیہ کا اپنا کوئی مادی فائدہ نہیں بلکہ یہ سب کچھ محکوم اقوام کی بہتری کے لیے کیا جا رہا ہے تو انھیں اس پر شکوہ کرنے کے بجائے شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھیں تہذیب سکھا دی گئی ہے اور سکھائی جا رہی ہے۔

---

[34] جان فلپ جینکنز، "White Supremacy"، انسائکلوپیڈیا برٹانیکا۔

[35] دینہ برچ، *The Oxford Companion to English Literature* (نیویارک: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، 2006ء)، 808۔

اس تصور پر خاصا ردعمل آیا۔ مارک ٹوین نے اس کے جواب میں مضمون لکھا جس کا عنوان تھا: "To the Person Sitting in the Darkness" (تاریکی میں بیٹھے شخص کے نام)۔ ایچ ٹی جانسن نے اس کے جواب میں "The Black Man's Burden" لکھی۔ ڈاکٹر ہارورڈ ٹیلر نے "The Poor Man's Burden" اور ارنسٹ کراسبی نے "The Real White Man's Burden" میں اپنا جواب آں غزل پیش کیا۔ جیمز باؤزر نے "Take up the Black Man's Burden" میں اپنا حال دل بیان کیا۔ افریقہ سے فلپائن تک اور خود امریکہ میں ردعمل آیا لیکن آج ایک طالب علم کے طور پر یہ سوال میرے دامن سے لپٹا ہے کہ میرا معاشرہ کہیں لاشعوری طور پر رڈیارڈ کپلنگ کے نکتہ نظر سے تو متاثر نہیں؟

سفید فام اقوام پر کوئی بوجھ ہے تو وہ یہ کہ انھوں نے کمزور قوموں کا استحصال کیا۔ انھیں اپنی سامراجیت سے مجروح کیا، ان کی معیشت کو ادھیڑ کر رکھ دیا، ان کی نفسیات کو گھائل کر دیا، انھیں صدیوں کم تر درجے کا انسان سمجھا اور اپنے پیچھے ایک ایسا طبقہ چھوڑ گئے جس کے ہاں اپنے احساس کمتری اور سفید فاموں کی برتری پر عمومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔

یہ سارا فکری، سیاسی، سماجی اور معاشی پس منظر جب ہمارے سامنے ہو تو ہمارے لیے یہ جاننا آسان ہو جاتا ہے کہ وہ کیا حالات تھے جن میں برصغیر میں نوآبادیاتی نظام نے قانون اور تعزیرات کا نیا نظام متعارف کرایا۔ یہ مطالعہ ہمیں اس نفسیاتی گرہ کی خبر بھی دیتا ہے جو ہمیں آج تک اس نوآبادیاتی قانونی ڈھانچے کی گرفت سے نکلنے نہیں دے رہا اور اسی کو پہلی اور آخری آفاقی صداقت سمجھ کر ایک ورثے کے طور پر گلے سے لگا کر بیٹھا ہے۔

باب دوم

احساس کمتری: نوآبادیاتی ورثہ؟

برطانوی نوآبادیاتی نظام سے پہلے برصغیر میں معاملات کیسے چل رہے تھے؟ کیا یہاں کوئی قانون موجود تھا اور اس کے پیچھے کوئی قوت نافذہ تھی یا معاملات بس ایسے ہی چلائے جا رہے تھے؟

سلطنت دہلی اور پھر مغل سلطنت کیا ایک لاقانونیت اور اور بے آئین بندوبست تھا، لوگ غاروں میں رہتے تھے، کسی قانون، نظام اور ضابطے سے واقف نہیں تھے اور پھر ریاست برطانیہ نے "White Man's Burden" کو محسوس کرتے ہوئے اپنی 'آفاقی ذمہ داری' نبھاتے ہوئے اس علاقے کے لوگوں کو جہاں 'تہذیب' سکھائی وہیں ایک قانونی اور انتظامی ڈھانچہ بھی عنایت فرمایا اور یوں پہلی بار اس خطے کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ قانون کیا ہوتا ہے اور قوت نافذہ کسے کہتے ہیں؟

لاہور ہائی کورٹ کی ویب سائٹ پر جہاں اس معزز عدالت کا تعارف کرایا گیا ہے وہیں 'ہائی کورٹ کی تاریخ' میں پیراگراف نمبر دو میں لکھا ہے:

> "1830ء تک پنجاب کے مشہور سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے صوبے بھر میں آزاد سرداروں کے زیر اقتدار ان گنت چھوٹی ریاستوں کو مستحکم کر دیا۔ اس استحکام سے قبل نہ تو کوئی قانونی عدالتیں تھیں نہ ہی تحریری قوانین موجود تھے اور نہ ہی ان کو برقرار رکھنے یا نافذ کرنے کا

کوئی مستند اور بااختیار ادارہ تھا۔۔۔ یہاں تک کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں بھی کوئی بڑی عدالتی اصلاحات متعارف نہ کروائی گئیں۔"[1]

اس کے بعد پھر آگے تفصیل بیان کی گئی ہے کہ کیسے برطانوی دور آیا تو نظام قانون میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ چنانچہ ہائی کورٹ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا گیا ہے: "1866ء سے قائم شدہ اپنے پیش رو کے نقش قدم پر استوار لاہور ہائی کورٹ کا باضابطہ قیام 21 مارچ 1919ء کو عمل میں لایا گیا۔"[2]

یہ بات اس حد تک تو درست ہو سکتی ہے کہ قانون، اس کی قوت نافذہ اور عدالتی نظام کی جو موجودہ اور جدید شکل ہے یہ برطانوی نوآبادیاتی نظام میں سامنے آئی ہے اور اس سے پہلے یہ اس شکل میں نہ تھی لیکن کیا یہ کہنا بھی درست ہے کہ رنجیت سنگھ کے اس استحکام سے قبل نہ تو کوئی قانونی عدالتیں تھیں نہ ہی تحریری قوانین موجود تھے اور نہ ہی ان کو برقرار رکھنے یا نافذ کرنے کا کوئی مستند اور بااختیار ادارہ تھا؟

اگر رنجیت سنگھ سے پہلے قانونی عدالتیں نہیں تھیں، تحریری قوانین نہیں تھے، ان کو برقرار رکھنے اور ان کو نافذ کرنے کا کوئی ادارہ نہیں تھا اور رنجیت سنگھ اور انگریز نے آکر ہی یہ سب کچھ متعارف کرایا تو پھر صدیوں تک یہاں مسلمان حکومتوں کے معاملات کیسے چلتے رہے؟ اس لاقانونیت کے عالم میں بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ مغل سلطنت دنیا کی امیر ترین سلطنت بن جاتی؟

[1] لاہور ہائی کورٹ کی ویب سائٹ پر اس کی تاریخ کے لیے دیکھیے:
https://www.lhc.gov.pk/urdu/history

[2] ایضاً۔

رنجیت سنگھ تو 1780ء میں پیدا ہوئے، اس صدی میں مغل سلطنت کا معاشی حجم یہ تھا کہ اس کی جی ڈی پی دنیا کی کل معیشت کا 24 فیصد تھا جو سارے یورپ سے زیادہ تھا۔[3] ہارورڈ یونی ورسٹی کے ماہر اقتصادیات پروفیسر جیفری گیل ولیم سن کے مطابق اٹھارویں صدی میں دنیا کی کل صنعتی پیداوار کا 25 فیصد مغل سلطنت پیدا کر رہی تھی۔[4]

آج یہ بات طے ہو چکی ہے اور سب کے مشاہدے میں ہے کہ جب تک سیاسی استحکام اور قانون کی حکمرانی نہ ہو تب تک معاشی استحکام نہیں آسکتا۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ مغل سلطنت اتنی بڑی معاشی قوت بن گئی جب کہ اس کے پاس نہ تو کوئی قانونی عدالتیں تھیں نہ ہی تحریری قوانین موجود تھے اور نہ ہی ان کو برقرار رکھنے یا نافذ کرنے کا کوئی مستند اور بااختیار ادارہ تھا؟ نیز یہ کہ یہ تحریری قوانین رنجیت سنگھ سے پہلے نہیں تھے تو رنجیت سنگھ نے کون سا قانونی مجموعہ مرتب کر کے متعارف کرایا؟

جب ہم برطانوی نوآبادیاتی نظام سے پہلے کے برصغیر کو دیکھتے ہیں اور محققین کے علمی ذخیرے سے رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قانونی عدالتیں بھی موجود تھیں، تحریری قوانین بھی دستیاب تھے اور ان کو برقرار رکھنے اور نافذ کرنے کے لیے مستند اور بااختیار ادارے بھی موجود تھے اور وہ کام بھی کر رہے تھے۔

قانون کے پروفیسر عمران احسن خان نیازی کے مطابق پاکستان کے قانونی نظام کی تاریخ برطانوی نوآبادیاتی نظام کی آمد یا رنجیت سنگھ سے شروع نہیں ہوتی، یہ برصغیر میں مسلمان

[3] اینگس میڈے سن، *The World Economy: Historical Statistics*، 256۔

[4] جیفری ولیم سن، 10۔

حکمرانوں کی آمد سے شروع ہوتی ہے اور ان مسلمان حکمرانوں نے ایک عدالتی نظام اور قانونی ڈھانچہ یہاں متعارف کرایا جو قریب آٹھ سو سال کامیابی سے کام کرتا رہا یہاں تک کہ پھر برطانوی نوآبادیاتی نظام نے اس کی جگہ لے لی۔[5]

اس ضمن میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بھی بہت اہم کام کیا ہے۔ کراچی یونی ورسٹی پریس نے ان کی کتاب *An Administration of the Sultanate of Delhi* کا اردو ترجمہ سلطنت دہلی کا نظم حکومت کے عنوان سے شائع کیا ہے جس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برطانوی نوآبادیاتی نظام قانون سے بہت پہلے یہاں مسلمانوں کی سلطنت بھی تھی، قانون بھی تھا اور ان قوانین کو نافذ کرنے کے لیے مستند اور بااختیار ادارے بھی کام کر رہے تھے۔ اس دور پر، اس کے اداروں اور اس کے طرز حکومت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن چوں کہ نوآبادیاتی نظام نے سماج کا طرز فکر ہی بدل دیا، اس لیے اس زمانے کے طرز حکومت پر لکھی تحریریں عصری بیانیے میں غیر متعلق سی قرار پا چکی ہیں۔[6]

حسن نظامی نیشاپوری نے ہندوستان ہجرت کی تو تاج المآثر لکھی جو دہلی سلطنت کی پہلی سرکاری تاریخ قرار دی جاتی ہے۔

ابو نصر محمد بن عبد الجبار عتبی کی کتاب تاریخ یمینی ہے جو غزنوی دور حکومت کا اہم ترین اور قدیم و مستند ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ غزنوی سلطنت میں قریب قریب وہ سارا علاقہ موجود تھا

---

[5] عمران احسن خان نیازی، *Legal System of Pakistan* (اسلام آباد: فیڈرل لاء ہاوس، 2018ء)، 29۔

[6] اشتیاق حسین قریشی، سلطنت دہلی کا نظم حکومت، ترجمہ: ہلال احمد زبیری (کراچی: کراچی یونی ورسٹی پریس، 2018ء)، 12-13۔

جو اس وقت پاکستان کہلاتا ہے اور 1151ء کے بعد سے اس کا دارالحکومت لاہور تھا۔

ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی کی تاریخ بیہقی ہے جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ بھی غزنوی دربار سے منسلک تھے۔ اس وقت ان تیس جلدوں میں سے صرف ایک جلد دستیاب ہے۔

قاضی منہاج سراج جوزجانی نے طبقات ناصری لکھی۔ انھیں ہندوستان کے اولین مسلمان مورخین میں شمار کیا جاتا ہے۔

ضیاء الدین برنی (جو اتر پردیش کے رہنے والے تھے اور اتر پردیش کے پرانے نام 'برن' کی نسبت سے برنی کہلائے) نے تاریخ فیروز شاہی لکھی جو غیاث الدین بلبن سے فیروز شاہ تغلق تک، یعنی سلاطین دہلی کے پچانوے سالہ کے اقتدار کی اہم تاریخ ہے۔ اس کتاب کو طبقات ناصری ہی کا تسلسل کہا جاتا ہے۔

شمس سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی (عفیف) لکھی۔ یہ بھی تغلق دور کے مورخ تھے۔

شہاب الدین کی عجائب المقدور فی اخبارات تیمور بھی ایک اہم تاریخی کتاب ہے۔ یحیٰ بن احمد بن عبد اللہ سرہندی نے سلاطین دہلی کی تاریخ پر کتاب لکھی جسے تاریخ مبارک شاہی کہا جاتا ہے۔

نعمت اللہ ہروی نے تاریخ خان جہانی لکھی۔ وہ شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں ایک تاریخ نویس کے طور پر منسلک تھے۔ یہ کتاب اگرچہ بنیادی طور پر افغان تاریخ ہے لیکن اس میں بنگال کے حکمرانوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

عباس سروانی کی تحفہ اکبر شاہی ہے جو انھوں نے تیسرے مغل فرماں روا جلال الدین اکبر کے کہنے پر لکھی۔

اہل اللہ مشتاق عرف رزق اللہ مشتاقی کی کتاب واقعات مشتاق ہے۔ خواجہ عبداللہ کی کتاب تاریخ داؤدی ہے، جو جہانگیر کے عہد میں لکھی گئی۔ یہ ہندوستان کے سلاطین کی تاریخ ہے۔

احمد یادگار کی تاریخ شاہی ہے جس میں لودھی سلطنت کے سلطان بہلول لودھی سے لے کر سلطنت سور کے حاکموں اور پھر مغل سلطنت کے سلطان جلال الدین اکبر کے دور تک کا تذکرہ ملتا ہے۔

نظام الدین احمد کی کتاب طبقات اکبری ہے۔ یہ بھی جلال الدین اکبر کے عہد حکومت تک کی تاریخ ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کی کتاب منتخب التواریخ کا مأخذ بھی اسی کتاب کو قرار دیا جاتا ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ سلطنت غزنویہ کے بانی امیر ناصر الدین سبکتگین کی تخت نشینی سے لے کر عہد اکبری تک کے حالات کا خلاصہ ہے۔

مرزا محمد حیدر دغلت کی تاریخ رشیدی بھی ایک اہم کتاب ہے۔ ان کا تعلق شاہی خاندان سے تھا اور وہ ظہیر الدین بابر کے ننھیالی رشتہ دار تھے۔ یہ کتاب ان کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔

جوہر آفتابچی کی تذکرۃ الواقعات ہے۔ اس کا اردو ترجمہ سید معین الحق نے کیا ہے جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ اس کتاب کو اسی سوسائٹی کے

اہتمام سے آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس کراچی سے شائع کیا گیا۔ یہ کتاب ہمایوں کی تاریخ کا بہترین مأخذ تصور کی جاتی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ابھی تک یہ فارسی زبان میں بھی شائع نہیں ہوئی اور اس کا صرف قلمی نسخہ موجود ہے چنانچہ علی گڑھ کی لٹن لائبریری کے نسخے کی مدد سے یہ اردو ترجمہ کیا گیا۔[7]

اللہ داد فیضی کی کتاب تاریخ ہمایوں شاہی ہے۔ گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ لکھی۔ گلبدن بیگم کا تعلق بھی شاہی خاندن سے تھا۔ وہ ظہیر الدین بابر کی بیٹی، ہمایوں کی بہن اور شہنشاہ اکبر کی پھوپھی تھیں۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے بھتیجے شہنشاہ اکبر کی فرمائش پر لکھی تھی۔ ہمایوں پر ہی بایزید کی تاریخ ہمایوں، خواندامیر کی ہمایوں نامہ بھی معروف تاریخی کتب ہیں۔ ابوالفضل کی اکبر نامہ بھی مغلیہ تاریخ کا اہم بیان ہے۔ یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی اور اس کی تین جلدیں ہیں۔

یہ ایک طویل فہرست ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ برصغیر میں برطانوی نوآبادیاتی نظام سے پہلے بھی ریاست موجود تھی، کارحکومت چل رہا تھا، قانون نافذ تھا اور اس کے پیچھے قوت نافذہ بھی موجود تھی۔ برصغیر کی سیاسی، قانونی اور ریاستی تاریخ برطانوی نوآبادیات سے شروع نہیں ہوتی۔ یہ قدیم تاریخ ہے اور اس کا تعلق محض گمان پر نہیں ہے، یہ وہ تاریخ ہے جو کتابوں میں لکھی جا چکی ہے اور کچھ کتب کے انگریزی تراجم بھی ہو چکے ہیں۔

معاملہ صرف یہ ہے کہ برطانوی نوآبادیاتی نظام کے بعد ہمارے ہاں ایک ایسی لاشعوری فکری گرہ سی پڑ گئی ہے کہ یہاں کی تاریخ پر اردو، فارسی، ترکی اور عربی میں جو کچھ لکھا گیا وہ اجنبی

---

[7] جوہر آفتابچی، تذکرہ الواقعات، ترجمہ: سید معین الحق (کراچی: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، 1955ء)۔

قرار پا چکا۔ اب معتبر صرف وہ ہے جو انگریزی زبان میں لکھا گیا ہے اور سند بھی وہی ہے۔ انگریز مورخین کے بھی اپنے مسائل اور تضادات ہیں۔ انھوں نے جو تاریخ بیان کی ہے اس میں یہ لاشعوری اہتمام موجود ہے کہ ہم سے پہلے کچھ نہیں تھا، جو تھا کسی قابل نہیں تھا اور یہ ہم ہی ہیں جنھوں نے برصغیر کو تہذیب سے روشناس کرایا، اسے ایک نظام دیا اور اسے قانون اور قوت نافذہ جیسی چیزوں سے متعارف کرایا جو وہ اس سے قبل جانتے ہی نہ تھے۔ تذکرۃ الواقعات کے مقدمے میں اسی رویے پر معین الحق لکھتے ہیں:

"یہ صحیح ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ پر ایک عرصے تک انگریز مورخوں اور بعد میں خود ہند [اور] پاکستانیوں نے بہت کچھ کام کیا ہے لیکن--- افسوس ہے کہ یورپی مصنفین میں سے اکثر مذہبی، نسلی اور دوسرے تعصبات کے زہریلے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ برصغیر کے دورِ جدید میں فنِ تاریخ کی بنیادیں ایسی روایات پر رکھی گئی ہیں جو کسی طرح قابلِ اطمینان قرار نہیں دی جاسکتیں۔"[8]

معاملہ مگر محض فنِ تاریخ کی بنیاد کا نہیں رہا۔ معاملہ یہ ہے برطانوی نوآبادیاتی نظام نے اس سماج کی فکری تشکیل میں خود شکستگی کا عنصر داخل کر دیا ہے اور ہم آج تک سفید فام برتری کے اس حیاتیاتی مغالطے سے باہر نہیں نکل پا رہے جو اب خود یورپ میں بھی دم توڑ چکا ہے۔ ہمارا احساس کمتری یہ مان کر نہیں دے رہا کہ برطانوی نوآبادیاتی نظام سے پہلے یہاں کی سلطنتیں سرزمین بے آئین نہیں تھیں اور یہاں ریاست کا پورا ڈھانچہ اپنے ان سارے لوازمات کے ساتھ موجود تھا جو ریاست کی تشکیل کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔

[8] ایضاً، 1۔

برصغیر کی مسلم حکومتوں کے قانونی نظام کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس فکری تنگنائے سے نکلنا ہو گا جس میں ہم کامن لاء کو لے کر پھنسے پڑے ہیں۔ مسلم معاشرے کا اپنا ایک قانون تھا جو یہاں نافذ تھا۔ اس کی شکل بھلے جدید قوانین کی طرح مدون نہ ہو لیکن اس کی موجودگی، اس کی اثر پزیری اور اس کی قوت نافذہ سے انکار ایسا رویہ ہے جس کا علم کی دنیا میں کوئی اعتبار نہیں۔

مثالی یقیناً نہیں تھیں لیکن برصغیر میں مسلمانوں کی ان حکومتوں کا قانون شرعی تھا۔ اب اس قانون کا محض اس بات پر ابطال نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی ہیئت نوآبادیاتی مجموعہ ہائے قوانین سے مختلف تھی۔ اس معاملے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ اسلامی قانون ہے کیا اور اس کا ماخذ کیا ہے۔

اسلامی قانون کے اپنے مآخذ ہیں جن میں قرآن، سنت، اجماع، قیاس اور پھر عرف اور مصلحت شامل ہیں۔ مسائل شرعیہ ان ہی سے اخذ کیے جاتے ہیں۔

قرآن تحریری شکل میں ہے۔ احادیث تحریری شکل میں موجود ہیں اور ان پر روایت اور درایت کے اعتبار سے بہت قابل قدر کام ہو چکا ہے۔ اسماء الرجال ہے جس میں کتب سوالات ہیں، کتب طبقات ہیں اور کتب تاریخ ہیں۔ یہ سارا کام غیر معمولی ہے۔ پھر فقہ کی دنیا میں بھی بہت کام ہوا ہے۔ اسلام کا تعلق چوں کہ فرد کی ذاتی زندگی سے ہی نہیں، نظم اجتماعی سے بھی ہے اس لیے فقہ اسلامی بھی محض عبادات تک محدود نہیں بلکہ یہ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے معاملات کو موضوع بناتی ہے۔

اسلام کو جب محض عبادات تک محدود تصور کر لیا جائے اور عملی زندگی اس کے تابع نہ رہے تو پھر یہ غلط فہمی جنم لیتی ہے کہ اسلامی قوانین اور فقہ اسلامی تو محض عبادات کے لیے خاص ہیں اب عملی زندگی کے لیے الگ سے کچھ قوانین درکار ہیں۔

برطانوی نوآبادیاتی نظام سے پہلے یہاں ایسی کوئی غلط فہمی نہ تھی اور نہ ہی یہاں کے مسلمان اپنی شناخت کے حوالے سے معذرت خواہانہ رویے کا شکار تھے۔ علم، فکر اور نفسیات کی دنیا میں یہ حادثہ بہت بعد میں رونما ہوا جب برطانوی نوآبادیات میں شرعی قوانین کو مسلمانوں کے چند معاملات تک محدود کرتے ہوئے اجتماعی زندگی سے انھیں نکال دیا گیا اور ایسے لوگوں کی تلاش شروع ہوئی جو ”رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں لیکن اپنے ذوق، اپنی فکر، اصولوں اور اپنے فہم کے اعتبار سے انگریز ہوں۔“ جیسے جیسے یہ تلاش کامیاب ہوتی گئی، فکری گرہ سخت ہوتی گئی۔ چنانچہ آج ہم برصغیر کی سلطنتوں کی فقہی دستاویزات کی بات کریں تو اس کی درست تفہیم میں اچھے خاصے معقول لوگوں کو مشکل درپیش ہوتی ہے۔

فقہ کے بارے میں مختلف ادوار میں یہ کوشش ہوتی رہی کہ اسے ریاست کا قانون قرار دے دیا جائے۔ خلیفہ منصور کے بارے میں روایت ہے کہ اس نے امام مالک کی موطأ کو ریاست کا قانون بنانا چاہا لیکن امام مالک نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ ہارون الرشید اور خلیفہ مہدی کے بارے میں بھی ایسی ہی روایات موجود ہیں۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے فقہاء گزرے ہیں لیکن ان میں سے جن کی فقہ کو کسی نہ کسی دور میں کسی حاکم نے کسی درجے میں قانون کی حیثیت دے دی وہ زیادہ معروف ہو گئیں۔ جو چار مذاہب اس وقت ہمارے ہاں معروف ہیں یہ سب کسی نہ کسی دور میں کسی درجے میں قانون کی حیثیت میں نافذ رہے۔

یہی معاملہ برصغیر میں بھی تھا۔ حکومتوں کے پاس قرآن، احادیث اور فقہ کی شکل میں قوانین موجود تھے۔ یہ کہنا مشکل ہو گا کہ یہاں کے حکمرانوں نے فقہ حنفی ہی کو اپنا ریاستی قانون بنایا

تاہم یہ حقیقت ہے کہ قانون سازی کی دنیا میں غالب کردار فقہ حنفی ہی کا رہا۔ برصغیر میں مسلم حکمرانوں کے مختلف ادوار میں متعدد قانونی و فقہی دستاویزات موجود رہیں۔[9]

- پہلی دستاویز فتاوی الغیاثیہ ہے۔ یہ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کی قانونی دستاویز ہے جو عربی زبان میں ہے۔ فقہ حنفی پر مشتمل ہے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ قریب ساڑھے سات سو سال قدیم اور تاریخی قانونی دستاویز ہے۔ اسے ہندوستان میں فقہ کی پہلی دستاویز کہا جاتا ہے۔
- دوسری قانونی دستاویز فتاوی قراخانی ہے۔ یہ فارسی زبان میں ہے اور فتاوی الغیاثیہ کی طرح یہ بھی ابھی شائع نہیں ہوا، مخطوطہ ہے یعنی ہاتھ سے لکھی ہوئی دستاویز ہے اور یہ بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ امکان ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے دور میں مرتب کی گئی۔
- تیسری قانونی دستاویز کا نام فوائد فیروز شاہی ہے۔ یہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے دور کی دستاویز ہے اور یہ بھی غیر مطبوعہ ہے۔ یہ مخطوطہ بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ترکی کی استنبول لائبریری میں بھی موجود ہے۔ ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری بانکی پور، پٹنہ میں موجود ہے۔ اسی دور کی ایک اور فقہی دستاویز کا نام فقہ فیروز شاہی ہے۔ اس کا تعلق بھی فیروز شاہ تغلق کے دور سے ہے۔ یہ بھی غیر مطبوعہ ہے اور اس کا قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔

[9] محمد اسحق بھٹی، برصغیر میں علم فقہ (لاہور: کتاب سرائے لاہور، 2009ء)، 50۔ یہ تمام دستاویزات جو یہاں نقل کی گئی ہیں، اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔

- چوتھی قانونی دستاویز کا نام فتاوی تاتار خانیہ ہے۔ اس کی تیس جلدیں ہیں۔ اتنا اہم کام بھی ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ دنیا کی پانچ لائبریریوں میں اس کی کچھ جلدیں دستیاب ہیں۔ حیدر آباد کے کتب خانہ آصفیہ پہلی نو جلدیں موجود ہیں۔ اسی طرح کتب خانہ خدیویہ، مصر میں چند جلدیں موجود ہیں، کتب خانہ بانکی پورہ میں تین جلدیں دستیاب ہیں اور کتب خانہ رام پور میں بھی دو جلدیں رکھی ہیں۔ صرف احمد آباد کا کتب خانہ پیر محمد شاہ ایسی لائبریری ہے جہاں اس کا پورا سیٹ دستیاب ہے۔ یہ کتاب سلطان فیروز شاہ تغلق کے امیر تاتار خان کی ہدایت پر لکھی گئی۔
- پانچویں کتاب فتاوی الحمادیہ ہے جو اس وقت کے قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس حماد جمال الدین کی ہدایت پر لکھی گئی۔ یہ کتاب چوں کہ اس وقت کے قاضی القضاۃ کی ہدایت پر لکھی گئی تھی اس لیے اس کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی ضابطہ فوجداری اور ضابطہ دیوانی پڑھ رہے ہیں۔ اس میں قاضی (جج) اور وکیلوں کے لیے الگ الگ باب ہیں جن میں ہر دو کے لیے ضابطہ اخلاق تجویز کیا گیا ہے۔ قانون شہادت اور شہادت کے آداب پر پورا باب ہے۔ اس کتاب میں "Dying Declaration" کی اہمیت پر بھی تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ یہ کتاب پنجاب یونی ورسٹی لائبریری، انڈیا آفس لائبریری لندن، مانچسٹر لائبریری، رام پور لائبریری، کتب خانہ خدیویہ، مصر اور حیدر آباد دکن کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔
- چھٹی کتاب فتاوی ابراہیم شاہی ہے۔ یہ دستاویز سلطان ابراہیم شرقی، والی جون پور کے دور میں تیار کی گئی اور ان کے قاضی (چیف جسٹس) احمد بن محمد جون پوری نے مرتب کی۔

- ساتویں دستاویز کا نام فتاوی امینیہ ہے۔ یہ بھی مخطوطہ ہے اور فارسی زبان میں ہے۔ اس کے دنیا میں کل تین نسخے موجود ہیں۔ ایک پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں دستیاب ہے، ایک ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی لائبریری میں رکھا ہے اور ایک کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔ اس میں بھی وکالت، قضا اور شہادت کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔
- آٹھویں دستاویز کا نام فتاوی بابری ہے۔ شہنشاہ بابر کی فرمائش پر یہ مجموعہ مرتب کیا گیا۔ شیخ نور الدین خوانی نے اسے مرتب کیا تھا، یہ بھی مخطوطہ ہے۔
- نویں دستاویز فتاوی عالمگیری ہے اس کی تیاری میں بہت سے علما نے حصہ لیا اور بعض مؤرخین نے اسے مغل سلطنت کا آئین قرار دیا ہے۔ چنانچہ رچرڈ ایٹن نے لکھا ہے کہ اورنگزیب نے بعض فرمان اسی فتاوی عالمگیری کی روشنی میں جاری کیے۔[10]

اورنگزیب عالمگیر ہی کے زمانے کا ایک فرمان ہے جو انھوں نے احمد آباد کے دیوان محمد ہاشم کو بھیجا تھا جسے 'فرمان عدالت' کہا جاتا ہے۔[11] اس میں الگ الگ شقوں میں مختلف جرائم کی سزاؤں کا بتایا گیا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس میں کچھ جرائم کی تقسیم وہی ہے جو قریب پونے دو سو سال بعد برطانوی فوجداری قانون میں دی گئی۔ جیسے ڈکیتی، سنگین ڈکیتی اور شاہراہ عام پر کی گئی ڈکیتی کو الگ الگ دفعات میں بیان کیا گیا۔ یہ نہ بھی کہا جائے کہ بعد میں مرتب ہونے والے نوآبادیاتی قانون نے اورنگزیب کے اس قانون سے کچھ اخذ کیا تب بھی اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ نو

10 رچرڈ ایٹن، *India's Islamic Traditions* (دہلی: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، 2003ء)، 168۔

11 خالد مسعود، "Religion and State in Late Mughal India: The Official Status of the Fatawa Alamgiri"، لمز لاء جرنل، لاہور، 3:1۔

آبادیاتی قانون سے پہلے بھی برصغیر میں ایک قانون تھا اور معاملات ریاست اسی کے تحت چلائے جا رہے تھے۔

برٹن سٹین کے مطابق فتاویٰ عالمگیری کے ذریعے اورنگزیب نے علما کی وہ توقیر بحال کرنے کی کوشش کی تھی، جو اکبر کے دور میں ختم ہوگئی تھی۔[12] لیکن یہ رائے تعصب پر مبنی لگتی ہے۔ کوئی بادشاہ اتنی بڑی علمی مشق صرف علما کی توقیر کے لیے کیوں کرے گا، اگر وہ خود اس کا ذوق نہ رکھتا ہو؟ بادشاہانہ طرز حکومت کے اپنے مسائل ہوتے ہیں اور اسے عین اسلامی حکومت کہنا ممکن نہیں ہوتا لیکن ان ساری قباحتوں کے باوجود بہت سارے شواہد موجود ہیں کہ اورنگزیب کا رجحان مذہب کی طرف تھا۔ لیکن یہاں مسئلہ اورنگزیب کا تو ہے نہیں، سوال تو یہ ہے کہ انگریز کے قانون سے پہلے یہاں کوئی قانون تھا یا نہیں اور اس کا جواب بہت واضح ہے کہ قانون اپنی قوت نافذہ کے ساتھ موجود تھا۔

نوآبادیاتی دور میں بنگال کے چیف جسٹس رہنے والے جارج کلاز رینکن لکھتے ہیں کہ جب گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے 1772ء میں ہندوستان میں قانون سازی کے لیے ایک پلان مرتب کیا تو اس میں ابتدائی مرحلے میں "Laws of the Koran" یعنی قرآن کے قوانین کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی جسے بعد میں سیکشن پندرہ میں بدل کر محمڈن لاء کر دیا گیا۔[13] کیونکہ قانون سازوں کو سمجھایا گیا کہ شرعی قانون کو سمجھنے کے لیے قرآن کے ساتھ ساتھ

[12] برٹن سٹین، *A History of India* (انگلینڈ: جان ویلے اینڈ سنز، 2010ء)، 177۔

[13] جارج کلاز رینکن، *Background to Indian Law* (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، 1946ء)، 6۔

سنت، حدیث اور اجتہاد جیسے دیگر مآخذ بھی ضروری ہیں اور یہ پورا ایک قانونی نظام ہے جو قانون سازی کرتا ہے۔

یہ بات ناقابل فہم ہے کہ برصغیر میں صدیوں سے رائج مسلمانوں کے اس قانون کو صرف اس بات پر قانون تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا جائے کہ اس کی ہیئت کامن لاء سے مختلف تھی۔ اس فکری گرہ کو نہ صرف سمجھنے بلکہ اسے کھولنے کی ضرورت ہے۔ احساس برتری اور احساس کمتری، دونوں رویے نامناسب اور غیر موزوں ہیں۔

برصغیر میں مسلمانوں کا دور حکمرانی چند سالوں کی بات نہیں، یہ عشروں پر محیط ہے۔ اس دور میں یہاں جو قانون نافذ تھا اس کی نفی کے دلائل کیا ہیں؟ یعنی آخر وہ کون سی وجوہات ہیں کہ اسے باضابطہ قانون ہی نہ تصور کیا جائے؟

اگر یہ قانون مدون نہیں تھا اور برطانوی قانون کی طرح قطعیت کے ساتھ دفعات (Sections) کی شکل میں موجود نہیں تھا تو کیا یہ اس کی خامی ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اصول اور قاعدے کے ساتھ پوری فقہ موجود تھی اور اس کا اطلاق قاضی کا فرض تھا۔ یہاں اگر قاضی کے پاس صوابدیدی اختیارات کسی کو 'اچھا قانون' نہیں لگتے تو یہ صوابدیدی اختیارات تو انگریزی قانون میں بھی جج کے پاس موجود ہیں اور ان کا دائرہ کار بھی غیر معمولی حد تک وسیع ہے۔

اگر ان اصولوں کا نوآبادیاتی نظام کی طرح سیکشن اور دفعات کی شکل میں نہ ہونا اس قانون کا نقص ہے تو پھر برطانیہ کے پاس تو آج بھی اپنا تحریری آئین نہیں ہے۔ آئین کی اہمیت قانون سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ کیسی جورسپروڈنس ہے جو بغیر آئین کے برطانیہ کو جمہوریت کی ماں بھی سمجھتی ہے اور ایک قومی ریاست (Nation state) بھی لیکن اسلامی

قوانین کے سارے مآخذ کی محض اس لیے نفی کر دیتی ہے کہ ان کی روشنی میں نو آبادیاتی نظام کی طرح سیکشن اور دفعات کی شکل میں اسے کیوں نہیں لکھا جاسکا؟

اگر مآخذ سے استنباط کرتے ہوئے فیصلہ سازی میں یہ امکان موجود ہے کہ مختلف قاضی مختلف معاملات میں مختلف فیصلے دیں گے تو یہ مسئلہ تو نو آبادیاتی قانون میں بھی موجود ہے جہاں ایک جیسے معاملات میں مختلف فیصلے موجود ہیں۔

اگر معاملہ یہ ہے کہ اس میں تقلید کا عنصر موجود ہے تو کامن لاء کا Stare Decisis کیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ تمام ماتحت عدالتوں کے لیے حرف آخر ہوتا ہے۔ اسلامی قانون میں تو اس بات کی وسیع تر گنجائش موجود ہے کہ قوانین کے مآخذ سے رجوع کرتے ہوئے نئے دور کے نئے چیلنج کے مطابق قاضی فیصلہ کرلے لیکن کامن لاء تو آپ کو عدالتی نظیر (Precedent) سے ادھر ادھر ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ کامن لاء کا تعارف ہی یہ ہے کہ یہ وہ قانون ہے جو ججوں کے فیصلوں پر مشتمل ہے یعنی "Judge made law" ہے۔[14] بلیکس لاء ڈکشنری کے مطابق کامن لاء کی بنیاد کسی آئین یا قانونی دستاویز پر نہیں بلکہ ان فیصلوں پر ہے جو مختلف جج مختلف اوقات میں کرتے رہے۔[15]

اگر سلطان کا فرمان جاری کرنا قانون کے تقاضوں سے فروتر سمجھا جاتا تھا تو یہ فرمان برطانوی بادشاہ سلامت بھی جاری کرتے تھے۔ نو آبادیاتی قانون یعنی کامن لاء کی بھی تو یہی

[14] برائن اے گارنر، *A Dictionary of Modern English Usage* (نیویارک، آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، 2003ء)، 177۔

[15] برائن اے گارنر، *Black's Law Dictionary* (نیویارک: تامس ویسٹ، 2014ء)، 334۔

تعریف ہے کہ یہ ایک ایسا قانون ہے جو برطانیہ کے تمام بادشاہوں کی عدالتوں میں کامن تھا۔[16] اگر قاضی کا انتخاب مسلمان سلطان کرتا تھا تو برصغیر میں کامن لاء کے تحت قائم عدالتوں کے ججوں کا انتخاب بھی برطانوی بادشاہ ہی کیا کرتا تھا۔ برطانوی بادشاہ کو تو چھوڑ دیں، آج کے پارلیمانی جمہوری دور میں کیا صدر پاکستان کے پاس صدارتی فرمان جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے؟

اگر سزا کے حتمی تعین کا سوال ہے کہ قاضی جب فقہی اصول کی بنیاد پر سزا سناتا تھا تو ایک ہی جیسے دو جرائم میں دو مختلف قاضی دو مختلف سزائیں سنا سکتے تھے جو مناسب نہیں تھا تو کیا کامن لاء میں بھی ججوں کو یہ اختیار نہیں اور کیا کامن لاء میں بھی سزاؤں کا تعین اسی طرح نہیں کیا جاتا کہ سزا اتنے سال قید تک ہو سکتی ہے یا سزا عمر قید یا سزائے موت ہو سکتی ہے؟ اب یہ جج صاحب پر منحصر ہے، چاہیں تو معاملے کی نوعیت دیکھتے ہوئے کم سے کم سزا دیں اور چاہیں تو زیادہ سے زیادہ سزا دیں یا مناسب سمجھیں تو دو انتہاؤں کے بیچ کی کوئی سزا سنا دیں۔

وقت کے تقاضوں کے مطابق قوانین کا ڈھانچہ بدلتا رہتا ہے۔ ہمارے پاس مغلیہ دور میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جب ریاست نے باقاعدہ دفعات کی شکل میں قانون بنا کر عمال حکومت کو بھیجے کہ ان معاملات میں یہ حکم ہے اور یہ سزا ہے۔ بدلتے وقت کے ان ہی تقاضوں کے تحت سلطنت دہلی سے سلطنت مغلیہ تک میں حکمران اور چیف جسٹس اپنی نگرانی اور اپنی ہدایات پر فتاوی کے مجموعے مرتب کراتے رہے۔ یہ اسلامی مآخذ کی روشنی میں اپنے اپنے دور کی قانون سازی ہی تو تھی۔ بعض اہل فکر کی رائے میں فقہ فیروز شاہی اپنے دور کا ضابطہ دیوانی یعنی

[16] لینگبین، لرنر سمتھ، *History of the Common Law: The Development of Anglo-American Lagal Institutions* (نیویارک: ایشین پبلشرز، 2009ء)، 4۔

"Code of Civil Procedure" بھی تھا، بعد میں جس کی جگہ فتاوی عالمگیری نے لے لی۔[17]

کیا ان سب قوانین کی نفی صرف اس بنیاد پر کی جا سکتی ہے کہ ان کا نام کامن لاء کے قانونی مجموعوں کی طرح کیوں نہیں تھا اور انھیں فتاوی کیوں کہا جاتا تھا؟ بہتری کی گنجائش یقیناً ہو سکتی ہے (اور وہ کامن لاء میں تو بہت زیادہ ہے) لیکن کامن لاء کو حرف آخر قرار دے دینا اور صدیوں رائج رہنے والے اسلامی قوانین کو قوانین ہی تسلیم نہ کرنا ایک ایسا رویہ ہے جو علم کی دنیا میں نامعتبر ہے۔

برطانوی نوآبادیاتی قانون سے پہلے برصغیر کے قانون کے ایک مختصر جائزے کے بعد اب دوسرا سوال برصغیر میں مسلمان حکومتوں کے عدالتی نظام اور اس کی قوت نافذہ کا ہے۔ برصغیر کی تاریخ کا ایک جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خاندان غلاماں کا دور حکومت ہو یا خلجی، تغلق اور لودھی حکمرانوں کا، شیر شاہ سوری کا ہو یا پھر مغلوں کا، ہر دور میں قانون اور عدالت بھی موجود تھے اور ادارے اور ان کی قوت نافذہ بھی۔

خاندان غلاماں سے لودھی حکومت تک چیف جسٹس کو 'میر عدل' کہا جاتا تھا اور نیچے قاضی القضاۃ اور قاضی حضرات کی عدالتیں ہوتی تھیں۔ شاہی عدالت سلطان کی ہوتی تھی۔ شیر شاہ سوری کے دور میں ڈھانچہ قدرے تبدیل ہوا اور سلطان کی عدالت کے بعد فوجداری اور دیوانی مقدمات کی عدالت الگ الگ کر دی گئی۔ دیوانی کی سب سے بڑی عدالت 'منصف منصفاں' کی تھی،

[17] محمد بشیر احمد، *The Administration of Justice in Medieval India* (علی گڑھ: بسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، 1941ء)، 1۔

اسے دیوانی مقدمات کا چیف جسٹس کہا جا سکتا ہے۔ فوجداری مقدمات کی سب سے بڑی عدالت کے جج کو 'شق دارِ شق داراں' کہا جاتا تھا۔ شرعی امور کے منصف کو قاضی کہا جاتا تھا۔ سیاسہ کے معاملات کو پھر دو حصوں میں بدل دیا گیا۔ سیاسہ کے دیوانی مقدمات کے ججز کو 'منصف' کہا جاتا تھا اور فوجداری کے ججز کو 'شق دار' کہا جاتا تھا۔[18]

مغل دور میں سب سے بڑی عدالت بادشاہ کی تھی۔ اسے 'دیوان مظالم' اور 'دیوان عدالت' کہا جاتا تھا۔ یہاں مقدمے کی سماعت کے دوران قاضی، مفتی، کوتوال، داروغہ، محتسب، مدعی سب موجود ہوتے تھے۔ جب اس عدالت میں اپیل کی سماعت ہوتی تھی تو بادشاہ اکیلا یہ معاملہ نہیں سنتا تھا بلکہ اس کے ساتھ قاضی القضاۃ اور اس کی عدالت کے قاضی بھی موجود ہوتے تھے اور یہ گویا ایک بنچ کی شکل میں سماعت کی جاتی تھی۔[19] دارالحکومت میں تین عدالتیں ہوتی تھیں۔ ایک مقامی قاضی کی، ایک قاضی القضاۃ کی اور ایک سلطان کی عدالت یعنی دیوان المظالم۔[20]

یہی ڈھانچہ پھر نیچے صوبوں میں تھا۔ صوبائی گورنر کی بھی عدالت تھی۔ یہ صوبے کی اوریجنل اور اپیل کورٹ تھی۔ اسے عدالتِ ناظم صوبہ کہا جاتا تھا۔ اس سے نیچے پھر ایک قاضی صوبہ کی عدالت تھی۔ جسے عدالتِ قاضیِ صوبہ کہا جاتا تھا۔ پھر دیوان صوبہ کی عدالت تھی، یہ ریونیو مقدمات کی کورٹ آف اپیل بھی تھی۔[21]

[18] عمران احسن خان نیازی، *Legal System of Pakistan*، 37۔

[19] محمد منیر، "The Administration of Justice in the Reign of Akbar and Aurangzeb: An Overview"، اے جرنل آف سوشل سائینسز (اگست، 2012ء)، 5:1۔

[20] علی محمد خان، میراث احمدی (بھارت: اورینٹل انسٹی ٹیوٹ بروڈا، 1927ء)، 1: 149۔

[21] محمد بشیر احمد، *The Administration of Justice In Medieval India*، 116۔

اس کے بعد ضلعی عدالت تھی جسے قاضیِ سرکار کہا جاتا تھا۔ اس سے نیچے قاضیِ پرگنہ کی عدالت ہوتی تھی۔ پرگنہ سے مراد دیہات ہوتے تھے۔ یہ دیہاتوں کی عدالت ہوتی تھی تاکہ وہاں کے معاملات وہیں نبٹا دیے جائیں۔ اس عدالت میں بھی قاضی کے ساتھ باقاعدہ عملہ ہوتا تھا۔ ایک میرِ عدالت، وکیل، مفتی، محتسب۔ پھر ایک فوجدار پرگنہ ہوتا تھا۔ اس کا کام ضلعی فوجدار یعنی فوجدارِ سرکار سے ملتا جلتا تھا۔ کہیں کہیں فوجدار کو توال بھی کہلاتا تھا۔[22] پرگنہ کی سطح پر ہی ایک 'امینِ پرگنہ' ہوتا تھا جو مقامی سطح پر ریونیو کے معاملات کو دیکھتا تھا۔ اس کے بعد پنچایت آتی تھی۔ اس کے سربراہ کو چودھری، مقدم یا پٹیل کہتے تھے۔ اس عدالت میں اگر دو ہندوؤں کا مقدمہ آتا تھا تو اس مقدمے کو پنڈت کے پاس بھیج دیا جاتا۔[23] پھر ایک 'قاضیِ عسکر' کی عدالت تھی جو فوجی کیمپوں میں تھی اور وہاں کے معاملات پر فیصلہ دیتی تھی۔ اسے 'قاضیِ اردو' کی عدالت بھی کہا جاتا تھا۔

عدالتوں میں داروغہِ کچہری، وقائع نگار، وقوعہ نویس، اخبار نویس بطور عملہ موجود ہوتے تھے جو عدالتی روداد کو لکھ لیتے تھے۔ ان کی رپورٹ قاضی القضاۃ اور بادشاہ تک جاتی تھی۔[24] کوئی عدالت صریح غلط فیصلہ کرتی تو اپیل میں صرف وہ فیصلہ منسوخ نہیں کیا جاتا تھا بلکہ جج کے خلاف بھی انکوائری کی جاتی تھی جو 'صدر الصدر' کی سربراہی میں ہوتی تھی۔

اسی زمانے کی اصطلاحات آج بھی مستعمل ہیں۔ ہمارے سول قانون کو آج دیوانی کہا جاتا

[22] علی محمد خان، میراث احمدی، 342۔

[23] محمد بشیر احمد، مصدر سابق، 342۔

[24] ایضاً، 342۔

ہے تو یہ مغلوں کے قانونی ڈھانچے میں 'دیوان' کے اہتمام کی نسبت سے کہا جاتا ہے۔[25] فوجدار کا منصب چوں کہ سیکیورٹی سے متعلقہ جرائم پر سزاؤں سے متعلق تھا تو آج بھی کرمنل لاء کو فوجداری قانون کہا جاتا ہے۔ وکیل کا منصب اسی دور میں متعارف کرایا گیا اور وکیل کو ایک روپیہ روزانہ سرکار سے معاوضہ ملتا اور وہ لوگوں کو قانونی امور پر مفت مشاورت دینے کا پابند تھا۔[26] عمل گزار، ناظر، تحویل دار، پیش کار جیسے کتنے ہی اہلکار ہوا کرتے تھے جن میں سے بعض آج بھی موجود ہیں۔ لفظ تھانہ اور چوکی اسی دور کے نظام قانون میں مستعمل تھے۔ صدیوں قائم رہنے والے جس نظام کے نقوش آج بھی موجود ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نظام کو سرے سے کوئی نظام ماننے سے ہی انکار کر دیا جائے؟

ریونیو کا نظام آج بھی اسی ڈھانچے پر کھڑا ہے جو مغل چھوڑ گئے تھے۔ پٹوار سسٹم برصغیر میں مغلوں نے ہی متعارف کرایا تھا۔[27] سڈنی اوون کی گواہی ہے کہ مغل حکومت اپنی ساری خامیوں کے باوجود بہتر حکومت تھی اور اس کے عدالتی نظام میں ہمارے (یعنی برطانوی نوآبادیاتی) نظام کی طرح تاخیر کا عنصر نہ تھا۔[28]

اس باب میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ بادشاہت کسی بھی عنوان سے قائم ہو اس کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت کو بھی ہم مثالی اسلامی طرز حکومت نہیں

[25] عمران احسن خان نیازی، *Legal System of Pakistan*، 33۔

[26] علی محمد خان، میراث احمدی، 149۔

[27] وسیم اشرف بٹ، "Punjab Revives old Patwar System by Replacing ACRs"، ڈان، 24 اپریل، 2021ء۔

[28] سڈنی اوون، *Fall of the Mughal Empire* (لندن: مرے پبلشرز، 1912ء)، 2۔

قرار دے سکتے۔ بلاشبہ اس طرز حکومت میں بھی مسائل تھے اور وہ قانونی ڈھانچہ جو ریاست کے لیے موجود ہوتا تھا بادشاہ اور اس کی افتادِ طبع پر بسا اوقات اس کا اطلاق نہیں ہو پاتا تھا اور حصول اقتدار کی تگ و دو میں تو ہر چیز پامال کر دی جاتی تھی۔ لیکن کیا اس استثنائی قباحت کی بنیاد پر پورے نظام انصاف کی نفی کی جا سکتی ہے؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو پھر 1947ء کے "Crown Proceedings Act" سے پہلے کے برطانوی کامن لاء اور نوآبادیاتی قانون کو کیسے ایک قانون تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

"Crown Proceedings Act, 1947" سے پہلے برطانوی بادشاہ کے خلاف کسی کو براہ راست عدالت جانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ یہ اجازت بھی اسی ایکٹ میں دی گئی اور وہ بھی جزوی اور صرف مالی معاملات میں۔ یعنی جس وقت لارڈ میکالے برصغیر کو تہذیب سکھانے کے لیے پریشان ہو رہے تھے اور رڈیارڈ کپلنگ سفید فام لوگوں کے اس اخلاقی بوجھ کا تذکرہ کر رہے تھے جو باقی دنیا کو مہذب بنانے کے لیے اس کے کاندھوں پر ڈال دیا گیا تھا اس وقت ان کے اپنے نظام انصاف میں بادشاہ قانون سے بالاتر تھا۔ دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ فوجداری معاملات میں آج بھی بادشاہ (ملکہ) کے خلاف عدالت جانے کی اجازت نہیں ہے، نہ ہی کسی قسم کی کارروائی کی۔

قانون کے نفاذ اور اطلاق کی اس استثنائی صورت حال سے ہٹ کر بھی دیکھ لیا جائے کہ قانون کیا کہتا ہے تو شرعی اصول تو یہ ہے کہ قانون سے کوئی بھی بالاتر نہیں لیکن کامن لاء کا اصول یہ ہے کہ "King Can Do No Wrong" یعنی بادشاہ سلامت جو کرتے ہیں درست کرتے ہیں، ان سے تو غلطی سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب شعور انسانی

ارتقا پذیر ہوا تو کامن لاء نے اس قانونی نکتے کی تاویلات کرتے ہوئے اس کی مختلف شرحیں بیان کرنا شروع کر دیں لیکن حقوق انسانی کے اس دور میں بھی کامن لاء کے ماہرین اور فیصلہ ساز یہ کہنے کو تیار نہیں کہ یہ قانون ہی غلط تھا اور ہم اسے ختم کر رہے ہیں یا اسے ختم کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے قانونی، عدالتی اور انتظامی ڈھانچے پر بہت لکھا گیا۔ اورنگزیب کے انتظامی احکامات بھی جمع کیے گئے اور عدالتی بھی۔ ان میں اگرچہ وہ اہتمام نہ تھا جو کامن لاء میں ہوتا ہے کیونکہ مغل عہد میں نظام انصاف ججوں کے فیصلوں کی تقلیدِ محض کا محتاج نہ تھا کہ قاضی القضاۃ فیصلہ سنا دیتے تو نیچے کی عدالتوں کے لیے وہ "Precedent" کی حیثیت اختیار کر جاتا لیکن اس کے باوجود کچھ دستاویزات تھیں، جن میں ان فیصلوں کا ذکر تھا اور ساتھ اورنگزیب کا یہ حکم بھی منسلک تھا کہ انھیں سنبھال کر رکھا جائے۔ انھیں اورنگزیب نے محضر نامہ کے نام سے لکھا ہے یعنی یہ عدالتی فیصلوں کا ریکارڈ تھا۔ ایسی ہی ایک دستاویز باقیات الصالحات تھی جس میں اس عہد کے پچاس عدالتی فیصلے محفوظ تھے۔ مغربی پاکستان کی ہائی کورٹ کے سابق جج، جسٹس بشیر احمد کا کہنا ہے کہ یہ دستاویز ان کے پاس تھی اور انھوں نے یہ نیشنل میوزیم کراچی کو دے دی تھی۔[29]

نظام عدل اور قانون میں ضابطے کے باب میں اورنگزیب کے چند اقدامات بہت اہمیت

[29] محمد منیر، "The Administration of Justice in the Reign of Akbar and Aurangzeb"، 12۔

کے حامل ہیں۔[30]

1. انھوں نے ریمانڈ کا باقاعدہ نظام متعارف کرایا۔ کوتوال کے لیے لازم قرار دیا گیا کہ اسے تفتیش کے لیے کسی شخص کو تحویل میں لینا ہے تو اس سے پہلے وہ قاضی سے تحریری اجازت نامہ لے۔ اس اجازت نامے کے بغیر کسی کو تحویل میں رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔
2. فیصلوں میں تاخیر کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے اورنگزیب نے حکم دے رکھا تھا کہ اگر پہلی سماعت پر کیس کا فیصلہ نہیں ہوتا تو کوتوال قیدی کو ہر روز قاضی کے پاس پیش کیا کرے گا، جب تک کہ مقدمے کا فیصلہ نہ ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک پیشی ہو اور اگلی سماعت تین ہفتوں بعد مقرر ہو اور اس روز اگر وکلاء ہڑتال پر ہوں تو ایک پیشی اور پڑ جائے۔
3. اورنگزیب کے فرمان کے مطابق کوتوال کو محض الزام پر کسی کو گرفتار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یعنی ایسا نہیں تھا کہ شکایت درج ہوتے ہی بندہ گرفتار کر لیا جائے۔ کوتوال کو گرفتاری سے پہلے یہ تسلی کرنا ہوتی تھی کہ بادی النظر میں الزام میں اتنا وزن اور معقولیت ہے کہ ملزم کو گرفتار کر لیا جائے۔
4. عدالتی اور انتظامی امور میں شفافیت کو یقینی بنانے کے لیے فیصلوں کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا اور لوگوں کو اس ریکارڈ تک رسائی کی عام اجازت تھی۔
5. اورنگزیب نے متعدد معاملات کے لیے تحریری قانون 'ضابطہ' بنایا اور حکم دیا کہ معاملات اس کے مطابق چلائے جائیں۔

30 علی محمد خان، میراث احمدی، 282-278۔

یہ احکام اور یہ دستاویزات اپنی اصل شکل میں بہت کم دستیاب ہیں۔ کچھ دستاویزات چند عجائب گھر میں رکھی ہیں اور کچھ قدیم لائبریریوں میں بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ کچھ اس دور کی لکھی گئی کتابوں میں بطور حوالہ درج ہوئیں اور ان میں سے بھی چند باقی رہ گئیں لیکن صدیوں پر مشتمل اس مسلمان دور حکومت کے نظام عدل و قانون پر جیسا مواد ہونا چاہیے تھا، وہ دستیاب نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ زوال کے سالوں میں مغل حکمرانوں کی باہمی کشمکش کے دنوں میں ضائع ہو گیا ہو یا ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر برطانوی اقتدار کے زمانے میں اسے دانستہ ضائع کر دیا گیا ہو تاکہ یہاں کے لوگوں کی یادداشت سے ان کا ماضی کھرچ دیا جائے اور پیچھے مطمئن قسم کی رعایا رہ جائے جو میکالے صاحب کے خیالات کے مطابق رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو مقامی ہو لیکن جو اپنے ذوق، اپنی فکر، اپنے اصولوں اور اپنے فہم کے اعتبار سے انگریز ہو۔ چنانچہ معتبر اب صرف وہ ہے جو انگریز مؤرخ نے لکھا ہے۔ مقامی لوگوں کی صدیوں پرانی کتابوں کے حوالے متروک ہو چکے اور علمی وجاہت سے فروتر سمجھے جاتے ہیں۔

اپنی تاریخ مگر ہم نے خود لکھنی ہے اور برصغیر میں مسلمانوں کے نظام قانون و انصاف کی حقیقت کا تعین ہم نے خود کرنا ہے۔ یہ کام ہمارے لیے غیر ملکی مؤرخین اور محققین نہیں کریں گے۔

اس مشق کا مقصد تقابل ہونا چاہیے نہ کسی کے نظام قانون کو کم تر دکھانا۔ اس کا مطلوب مگر یہ ضرور ہے کہ چیزوں کی ترتیب درست کر دی جائے اور ہمیں درست تناظر میں پورے سیاق و سباق کے ساتھ معلوم ہو کہ برصغیر میں صدیوں تک رائج اسلامی نظام قانون کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ انگریزی نو آبادیاتی نظام سے پہلے مسلمانوں نے صدیوں کے اقتدار

میں نہ کوئی قانون دیا، نہ کوئی عدالت تھی اور نہ کوئی قوت نافذہ اور یہ سارا بندوبست ہمیں برطانوی نوآبادیاتی نظام نے عطا کیا۔

باب سوم

برصغیر کا اسلامی نظامِ قانون: چیئرمین ایسٹ انڈیا کمپنی کی گواہی

نوآبادیاتی نظام سے پہلے کے برصغیر میں نظام انصاف اور نظام حکومت کے بارے میں ایک اہم گواہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیئرمین سر آرچی بیلڈ گیلوے کی ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ برصغیر میں انگریزوں کے آنے سے پہلے کوئی باقاعدہ نظام قانون وانصاف نہیں تھا اور یہ کار خیر برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام نے انجام دیا تو اسے اپنے فکری مغالطوں کے ازالے کے لیے سر آرچی بیلڈ گیلوے کو لازمی پڑھنا چاہیے۔

آرچی بیلڈ گیلوے کی گواہی اس لیے بھی اہم ہے کہ وہ برطانوی نوآبادیاتی بندوبست کی انتہائی اہم شخصیت تھے۔ یہ برطانوی فوج کے میجر جنرل تھے، 1810ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر رہے، 1848ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈپٹی چیئرمین بنے اور 1849ء میں کمپنی کے چیئرمین کے منصب پر فائز ہوئے۔[1] آرچی بیلڈ گیلوے تزویراتی امور اور قانون کے ماہر تھے۔ اسلامی قوانین اور بالخصوص حنفی فقہ سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ان کا شمار فتاوی

1 “Allen's Indian Mail, and Register of Intelligence of British & Foreign India, China, & All Parts of the East”، جنوری-دسمبر (لندن: ڈبلیو ایم ایچ ایلن اینڈ کو، لیڈن ہال سٹریٹ، 1850ء)، 3: 238۔

عالمگیری کے ماہرین میں ہوتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ وہ فتاوی عالمگیری کو ہندوستان کا تحریری آئین اور قانون قرار دیتے ہیں۔انھوں نے اسلامی قانون کی شرح پر *A Commentary on Mohammadan Law* کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ یہ کتاب اس وقت دستیاب نہیں اور پوری کوشش کے باوجود میں اسے تلاش نہیں کر سکا۔یہ کتاب اگر مل جائے تو اسلامی قوانین کے بارے میں آرچی بیلڈ گیلوے کا نکتہ نظر مزید وضاحت اور تفصیل کے ساتھ سامنے آسکتا ہے۔اتنے اہم شخص کی اتنی اہم کتاب کے یوں منظر سے غائب ہو جانے سے یہ بات بھی سمجھ آتی ہے کہ مغل دور کے نظام قانون کی دستاویزات آج کیوں دستیاب نہیں ہیں۔ہو سکتا ہے وقت کے ہاتھوں یہ ریکارڈ ضائع ہو گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک اہتمام کے تحت اسے منظر سے ہٹا دیا گیا ہو۔کیونکہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کا چیئر مین ہی اسلامی نظام قانون کی تحسین کر رہا ہو تو پھر مسلمانوں کو اس بات پر کیسے قائل کیا جاتا کہ برطانوی نوآبادیاتی نظام سے پہلے ان کے پاس کوئی قانون، عدالت اور نظام موجود نہیں تھا اور یہ نعمت انھیں سلطنت برطانیہ نے عطا فرمائی۔

آرچی بیلڈ گیلوے کی ایک اور کتاب البتہ دستیاب ہے۔یہ کتاب 1832ء میں لندن سے شائع ہوئی اور یہ ہندوستان میں قانون، آئین اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے طرز حکومت اور مغل دور میں مالی اور انتظامی معاملات پر اسلامی قوانین کے بارے میں ان کے مشاہدات اور تاثرات اور اس کے نتیجے میں دی گئی سفارشات کا مجموعہ ہے۔

یہ مجموعہ *Observations on the Law and the Constitution and present Government of India* کے نام سے شائع ہوا اور اگرچہ اس کا تعلق براہ راست اسلامی قوانین سے نہیں ہے تاہم اس میں بھی آرچی بیلڈ گیلوے کے مشاہدات اور نتائج فکر انتہائی

اہمیت کے حامل ہیں۔ متعدد مقامات پر اسلامی فقہ کے حوالے اور ایک مقام پر قرآنی آیت کا حوالہ بھی موجود ہے۔اپنے عصری چیلنجز سے نبٹنے کے لیے نہ صرف برصغیر میں رائج اسلامی قوانین کے حوالہ جات ملتے ہیں بلکہ ان کی افادیت کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔اس کتاب کے مندرجات کا مطالعہ ہماری عمومی خود شکستگی کا ازالہ کر سکتا ہے اور ہمیں اس رضاکارانہ مرعوبیت سے نکال سکتا ہے جسے ہم اپنی تقدیر سمجھ کر گلے لگائے بیٹھے ہیں۔

اس مجموعے کو بھی گیلوے کی *A Commentary on Mohammadan Law* کی طرح منظر سے ہٹا دیا گیا۔پاکستان میں پہلی بار اس مجموعے کا تذکرہ بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد، شعبہ قانون کے سابق چیئر مین پروفیسر عمران احسن خان نیازی کی کتاب *Legal System of Pakistan* میں کیا گیا۔اور یہ کتاب بھی ان ہی کے حلقہ اثر کی کاوشوں سے سامنے آئی۔

اس زمانے کی بہت سی کتب آرکائیوز میں دستیاب ہیں تو گیلوے جیسی اہم شخصیت کی کتاب کیسے گوشہ گمنامی میں جا کر منظر سے غائب ہو گئی؟ اہل فکر کے خیال میں اس کی ایک وجہ آرچی بیلڈ گیلوے کے وہ خیالات ہو سکتے ہیں جہاں انھوں نے اسلامی قانون کو برطانوی کامن لاء پر ترجیح دی ہے۔[2] آرچی بیلڈ گیلوے نے ہندوستان میں طویل وقت گزارا۔ برصغیر میں ان کے قیام کا دورانیہ پینتیس (35) سال کے قریب ہے۔اس دوران انھوں نے جنگوں میں بھی حصہ لیا، انتظامی امور بھی دیکھے، قانونی امور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مشاورت بھی کی اور ایک وقت آیا اس کی سربراہی بھی سنبھالی۔ یادداشتیں بھی لکھیں اور عسکری امور پر بھی قلم اٹھایا۔اسلامی فقہ اور

[2] عمران احسن خان نیازی، *The legal system of Pakistan*، 261۔

شرعی قوانین کی شرح بھی تحریر کی۔ عسکری امور پر ان کی کتاب کی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے خود اس کی اشاعت کا اہتمام کیا اور اسے نہ صرف ملٹری کالجز میں پڑھایا جاتا رہا بلکہ افسران میں اس کے نسخے بھی تقسیم کیے گئے۔ یعنی ان کی رائے کسی ایسے آدمی کی رائے نہیں جو بہت دور بیٹھ کر تجزیے کر رہا ہو بلکہ وہ ایک ایسے آدمی کا موقف ہے جو پینتیس سال برصغیر میں اہم عہدوں پر فائز رہ کر معاملات کو براہ راست دیکھ رہا ہے اور پھر اپنے علم اور مشاہدے کی بنیاد پر ایک رائے قائم کر رہا ہے۔

اتفاق دیکھیے کہ ان کی پانچ میں سے وہی دو کتابیں غائب ہو جاتی ہیں جن میں اسلامی قانون پر بات کی گئی ہے۔ ان 'گمشدہ' کتابوں میں سے ایک کتاب کے چند اہم مندرجات یہاں پیش خدمت ہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ *A Commentary on Mohammadan Law* بھی ایک دن صاحبان جستجو کہیں سے نکال لائیں گے۔ جب تک یہ کتاب منظر عام پر نہیں آتی، تب تک دستیاب کتاب *Observations on the Law and the Constitution and present Government of India* کا ہر سطح پر ابلاغ ہونا چاہیے۔ ہر صاحب اختیار اور صاحب الرائے کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن، جو یونی ورسٹی آف کیلی فورنیا کی لائبریری سے تلاش کیا گیا، 1832ء میں شائع ہوا۔[3] اس کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ بھی اس کا حصہ ہے۔ اس دیباچے میں آرچی بیلڈ گیلوے نے اسی نفسیات کو مخاطب کیا ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ برصغیر میں مغلوں کے زمانے میں نہ کوئی قانون تھا، نہ آئین تھا، نہ کوئی ضابطہ تھا اور نہ ہی قوت نافذہ تھی۔

3 Allen's Indian Mail, and Register of Intelligence of British & Foreign India, China, & All Parts of the East.

چنانچہ وہ بڑے ہی لطیف پیرائے میں برطانوی قانون سازوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاید یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ مغلوں کا سارا آئینی ڈھانچہ نہ صرف تباہ ہو چکا ہے بلکہ اس کی باقیات کا بھی کوئی نام و نشان نہیں رہا اور اب اس نظام قانون کی باقیات کی تلاش بھی ناممکنات میں سے ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر برطانوی حکومت کی انسان دوستی اسے مجبور کرتی کہ وہ مغل دور کے اس آئینی بندوبست کو اکھاڑ کر پھینک دینے کے بجائے اس کی نوعیت اور قدر کا جائزہ لے۔[4]

دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں بھی آرچی بیلڈ گیلوے نے قانون سازی کی اسی فکری گرہ پر تنقید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ ہندوستان میں بہتر طرز حکومت کی خواہش میں نئے نئے منصوبے پیش کرنے کی بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں، ان لوگوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کی ہندوستان کے بارے میں معلومات کم ہیں۔[5]

یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب ہندوستان سے مغل اقتدار کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا اور بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ دوم کی حکومت تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے خود کو بادشاہ کا مطیع اور فرماں بردار کہلوانا بند کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہ نے لارڈ ہیسٹنگز سے ملاقات کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ملاقات ہو گی تو صرف بادشاہ اور اس مطیع و فرماں بردار لارڈ ہیسٹنگز کے درمیان ہو گی۔ تاہم یہ مغلوں کے زوال کا وقت تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اکبر شاہ کو شہنشاہ ہندوستان کے بجائے شاہ دہلی کہنا شروع کر دیا تھا اور سکوں پر سے فارسی کی عبارت بھی ختم کر دی گئی تھی اور بادشاہ کا نام بھی۔ بادشاہ کو دہلی تک محدود کر دینے

4 آرچی بلیڈ گیلوے، ix۔

5 ایضاً، xiii۔

کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی ریاستوں کے والیان کی سرپرستی کر رہی تھی کہ وہ خود شاہی خطابات لے کر اپنی خود مختار حکومتوں کا اعلان کریں اور بادشاہ دہلی کی فرماں برداری سے خود کو آزاد کر لیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر سے مسلمانوں کا اقتدار گویا ختم ہو چکا تھا۔ ٹیپو سلطان کو شہید ہوئے تیس سال ہو چکے تھے۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد یہ طے ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو چیلنج کرنے والا اب کوئی نہیں رہا۔ خود ٹیپو سلطان کے دور میں بھی، جب وہ انگریزوں سے لڑ رہے تھے، مغل سلطنت دہلی تک محدود ہو چکی تھی اور لوگ کہا کرتے تھے: سلطنتِ شاہ عالم، از دلی تا پالم۔ پالم اس وقت دلی کے جنوب مغرب میں دس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔[6]

بعد میں 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی اور بہادر شاہ ظفر کی معزولی، گرفتاری اور جلاوطنی کے بعد جب ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے براہ راست برطانوی عمل داری میں آیا تو فاتحین کا رویہ مختلف ہو چکا تھا۔ لیکن جس دور میں یہ کتاب لکھی گئی، اس زمانے میں بھی برطانوی قانون ساز ہندوستان میں اپنے زیر قبضہ علاقوں کے لیے قانون سازی کر رہے تھے۔ آرچی بیلڈ گیلوے کی یہ کتاب اسی موقع پر قانون سازوں کے سامنے رکھے گئے اپنے مشاہدات اور سفارشات کا مجموعہ ہے۔

اس کتاب کا پہلا باب ہماری اس بحث سے متعلق ہے کہ برطانوی نوآبادیاتی نظام سے

---

6 ہربرٹ چارلس فن شاو، *Delhi: Past and Present* (مدراس: ایشین ایجوکیش سروسز، 1998ء)، 4۔

پہلے برصغیر کا قانونی ڈھانچہ کیا تھا۔ یہاں کوئی قانون، کوئی ضابطہ، کوئی قوت نافذہ، کوئی بندوبست موجود تھا یا اک عمر رائیگاں تھی جو بسر کی جا رہی تھی؟ اس باب کا عنوان ہے: *Observations on the Law and the Constitution of India.*

آرچی بیلڈ گیلوے اس باب کا آغاز ایک سوال سے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ برطانوی قانون سازوں نے یہ تو کہہ دیا ہے کہ ہندوستان میں اپنے وفاداروں کے حقوق کا تحفظ 'ہندوستان کے آئین اور قوانین' کے مطابق یقینی بنایا جائے گا لیکن کیا انھیں یہ بھی علم ہے کہ یہاں کا آئین اور قانون ہے کیا؟ پھر وہ اس کا خود ہی جواب دیتے ہیں کہ ان فیصلہ سازوں کو اس کا علم نہیں ہے۔ گیلوے کہتے ہیں کہ چلیں یہ تو مان لیا گیا کہ ہندوستان میں پہلے سے ایک آئین اور قانون موجود ہے لیکن جب یہ نکتہ مان لیا گیا تو اب اس بات پر ابہام کیوں رکھا جا رہا ہے کہ آخر وہ آئین کیا ہے اور وہ قوانین کیا ہیں جن کی روشنی میں انسانی نسل کے اتنے بڑے حصے کے حقوق کا تحفظ کیا جانا مقصود ہے۔[7]

گیلوے کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو اتنا عرصہ ہو گیا ہے تو ایک آدمی توقع رکھتا ہے کہ ایسا تو نہیں ہوا ہو گا کہ حکمرانوں نے اس سارے دورانیے میں یہ جاننے کی کوشش ہی نہ کی ہو کہ یہاں کا آئین اور یہاں کے قوانین کیا ہیں اور ان کی نوعیت کیا ہے۔[8]

گیلوے کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے تحریری قوانین کی قریب نو سو سال پر محیط عرصے کے حقائق اور واقعات کی روشنی میں تصدیق کی ہے اور اس کا حاصل کلام یہ ہے کہ صرف اسلامی

---

7 آرچی بیلڈ گیلوے، 1۔

8 ایضاً۔

قانون (محمڈن لاء) ہی ہندوستان کا قانون تھا۔[9]

آرچی بیلڈ گیلوے اس بات پر خاصے برہم دکھائی دیتے ہیں کہ برطانوی مؤرخین اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرتے کہ برصغیر میں صرف ایک ہی قانون صدیوں تک رائج رہا اور وہ اسلامی قانون تھا۔ ان کے خیال میں اگر ہندوستان پر لکھنے والے برطانوی مؤرخین کو اسلامی قانون کا کچھ علم ہوتا تو ان کا رویہ مختلف ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کے سب محمڈن لاء سے بے خبر تھے۔[10]

چنانچہ گیلوے سوال اٹھاتے ہیں کہ جب حکومت ہمارے یعنی انگریزوں کے ہاتھ میں آئی اگر اس وقت یہاں کا قانون اور آئین (محمڈن) اسلامی نہیں تھا تو پھر مجھے پوچھنے دیجیے کہ اس وقت یہاں کون سا آئین اور کون سا قانون نافذ تھا؟ کیا وہ مرہٹوں کا کوئی قانون اور آئین تھا جو یہاں نافذ تھا؟ مرہٹوں کی تو اپنی بنیادیں یہاں ایسے ہی ہیں جیسے ہماری ہیں اور ان کو پہلی بار ایک طاقت کے طور پر بہادر شاہ کے دور میں 1701ء میں تسلیم کیا گیا۔[11]

آرچی بیلڈ گیلوے اس نکتہ نظر کو قبول نہیں کرتے کہ برطانوی بندوبست سے پہلے یہاں کوئی قانون نہیں تھا۔ اپنی کتاب کے باب دوم میں وہ لکھتے ہیں کہ ہمیں یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ ہندوستان کے مسلم فاتحین کے پاس ایک تحریری قانون موجود تھا[12] اور ہندوستان میں برطانیہ کی آمد سے سات صدیاں پہلے سے ہندوستان میں جو قانون نافذ تھا وہ محمڈن لاء یعنی

9 ایضاً، 27۔
10 ایضاً، 28۔
11 ایضاً، 29۔
12 ایضاً، 37۔

اسلامی قانون تھا۔[13] ان کے خیال میں یہ حقیقت کسی شک و شبہے کے بغیر ثابت ہو چکی ہے کہ صرف اسلامی قانون ہی کو ہندوستان میں آئین اور قانون کی حیثیت حاصل تھی۔[14]

گیلوے اس عمومی غلط فہمی کا بھی ازالہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے برصغیر کو کوڈ آف لاء نہیں دیا تھا اور نظام قانون منتشر حالت میں تھا۔ گیلوے لکھتے ہیں کہ اورنگزیب، اکبر اور تیمور نے ہندوستان میں باقاعدہ کوڈ آف لاز متعارف کرائے جن میں سے اورنگزیب کا فتاوی عالمگیری زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کے لیے اورنگزیب نے ہندوستان بھر سے جید اہل علم کو اکٹھا کیا اور سالوں کی محنت کے بعد ایک کوڈ آف لاء تیار کیا۔ قانون کے اس مجموعے کو اورنگزیب کی نسبت سے فتاوی عالمگیری کہا گیا۔[15]

اورنگزیب کے جس فتاوی عالمگیری کو ہمارا ناقص فہم قانون تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس محض ناقابل نفاذ قسم کے فتوے سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے، اس مجموعہ قانون کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیئرمین کے منصب پر فائز رہنے والی شخصیت نے اورنگزیب کے دور کی سب سے بڑی اور ان مٹ یادگار قرار دیا ہے۔ اس دستاویز کے لیے انھوں نے "The greatest and certainly the most lasting monument of his reign" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔[16]

13 ایضاً۔
14 ایضاً، 32۔
15 ایضاً، 25۔
16 ایضاً۔

اس وقت پاکستان میں جب ہم قانونی دستاویزات اور مجموعوں کی بات کرتے ہیں تو کامن لاء نے ہمیں نفسیاتی گرفت میں لیا ہوا ہے اور ہم ایسے ان دیکھے احساس کمتری کا شکار ہو چکے ہیں کہ جس دستاویز کے ساتھ فتوے یا فتاوٰی کا لفظ لکھا ہو وہ ہمارے تصور قانون کے (ناقص) معیار پر پورا نہیں اترتا۔ لیکن آرچی بیلڈ گیلوے لکھتے ہیں کہ فتاوی عالمگیری کو اس سلطنت کا تحریری آئین اور قانون سمجھا جانا چاہیے۔[17]

برطانوی نوآبادیاتی نظام سے پہلے کے مغل ہندوستان میں قانونی نظام کیسا تھا؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے گیلوے لکھتے ہیں کہ اورنگزیب کے لاء آفیسرز کی قوت کا یہ عالم تھا کہ وہ جن صوبوں میں تعینات ہوتے تھے وہاں کے گورنرز بھی ان کے آگے سر تسلیم خم کیے رکھتے تھے۔[18]

مغل بادشاہت یقیناً حقیقی معنوں میں شرعی نظام نہیں تھا۔ اس کی اپنی قباحتیں بھی تھیں اور بادشاہ کے سامنے قانون بھی بے بس ہو جایا کرتا تھا اور کامن لاء کی طرح ہاتھ کھڑے کر دیتا تھا کہ "King Can Do No Wrong"۔ چنانچہ گیلوے بتاتے ہیں کہ جب اورنگزیب نے حیدر آباد پر حملے کا فیصلہ کیا تو ان کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) نے حکم دیا کہ ایک مسلمان ریاست پر حملہ جائز نہیں۔ چنانچہ قاضی کو معزول کر دیا گیا اور انھیں ریاست سے نکلنا پڑا۔ لیکن گیلوے ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ پہلے قاضی کے اس انجام کے باوجود جب دوسرا قاضی تعینات کیا گیا تو اس نے بھی آتے ہی یہی فیصلہ سنا دیا کہ ایک مسلمان ریاست پر

[17] ایضاً، 25۔

[18] ایضاً، 26۔

حملے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس قاضی کو بھی تذلیل کا سامنا کرنا پڑا۔ گیلوے یہاں سوال پوچھتے ہیں کہ جس نظام قانون کا قاضی انصاف کے لیے اس حد تک جاسکتا ہو اس قوم میں انصاف کی قدر و منزلت کیسی ہو گی۔[19]

تذکیر کے طور گیلوے ایک شاہی فرمان کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے بادشاہ، شاہ عالم کا فرمان ہے جو انھوں نے 29 اکتوبر 1764ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام جاری کیا۔ اس میں لکھا تھا کہ کمپنی نشہ آور اشیا کے استعمال کے روکنے کے لیے اپنی بہترین کوششیں کرے کیونکہ نشہ آور اشیا کا استعمال خدا کے قانون میں منع ہے۔ اس فرمان کا حوالہ دینے کے بعد گیلوے لکھتے ہیں کہ اس سلطنت کا قانون محمڈن لاء ہی تھا۔ چنانچہ ان کے مطابق ہندوستان کا کوئی ایک بھی مقامی آدمی ایسا نہیں ہے جو ایک قانون کے دوسرے قانون سے فرق کو سمجھتا ہو اور اس کے باوجود وہ اس بات سے مکمل طور پر آگاہ نہ ہو کہ محمڈن لاء یعنی اسلامی قانون ہی اس سلطنت کا قانون تھا۔[20]

اس زمانے میں برطانوی قانون سازوں کا رجحان یہ تھا کہ برصغیر میں بعض ہندو روایات کو بھی مقامی قانون کا درجہ دیا جائے اور اسے بھی ہندوستان کے آئین اور قانون کی حیثیت دی جائے۔ گیلوے اسی تناظر میں لکھتے ہیں کہ کئی صدیوں سے برصغیر میں ایک ہی قانون ہے اور وہ مسلمانوں کا قانون ہے۔ گیلوے کے مطابق 'ہندو قانون' کبھی بھی یہاں رائج نہیں رہا اور نہ اس کا باقاعدہ کوئی وجود ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب کے باب پنجم کے آغاز میں انھوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ

[19] ایضاً، 27۔

[20] ایضاً، 30۔

کونسل کے گورنر جنرل کے قانون کے طور پر ہندو کوڈ کو تسلیم کر لیا گیا لیکن یہ بات کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ ہندوستان کا تحریری قانون ایک ہی تھا اور وہ محمڈن لاء تھا۔

ان کے خیال میں جب برطانوی قانون ساز یہ کہہ چکے ہیں کہ ہندوستان کو مقامی آئین اور قانون کے مطابق چلایا جائے گا تو اب حکومتی مشینری اس بات کی پابند ہے کہ وہ معاملات کو اسلامی قانون کے مطابق چلائے کیونکہ ہندوستان کا آئین بھی محمڈن لاء تھا اور ہندوستان کا پبلک لاء بھی محمڈن تھا۔ گیلوے تکرار کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اس کے علاوہ یہاں کوئی آئین اور کوئی قانون نہیں تھا۔ گیلوے کا کہنا ہے کہ 'ہندو قانون' نام کی کوئی چیز کہیں وجود نہیں رکھتی اور نہ ابھی تک کوئی ایسی چیز دریافت کی جا سکی ہے جسے 'ہندو ضابطہ قانون' کا نام دیا جا سکے۔[21]

گیلوے کے خیال میں جس چیز کو ابھی تک ہندو قانون کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اس کا اگر جائزہ لیا جائے تو اسلامی قانون واضح طور پر برتر حیثیت کا حامل ہے۔ گیلوے کا کہنا ہے کہ علم قانون میں 'ہندو قانون' کی اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ان کا وراثتی قانون بھی بنگال میں کچھ اور ہے اور بنارس میں کچھ اور ہے۔[22] ہندو قانون پر تبصرہ کرتے ہوئے آرچی بیلڈ گیلوے نے لکھا کہ ایسے قوانین صرف انسانی شعور کی کمزور ترین کیفیت میں ہی وجود میں آ سکتے ہیں۔[23]

آگے چل کر گیلوے اسلامی قوانین کو بعض معاملات میں خود اپنے برطانوی قوانین

[21] ایضاً، 286۔

[22] ایضاً، 287۔

[23] ایضاً، 288۔

سے بھی بہتر قرار دیتے ہیں۔ وہ مسٹر مل کی ایک تحریر کا اقتباس نقل کرتے ہیں۔[24] جس میں مسٹر مل نے لکھا کہ ایک فرد کے حقوق کی سخت اور درست تعریف متعین کرنے میں، رومن لاء، انگلش لاء اور محمڈن لاء (اسلامی قانون) قریب قریب ایک ہی سطح پر ہیں۔[25]

دلچسپ بات یہ ہے کہ گیلوے کو اس نکتے سے بھی اختلاف ہے اور وہ اسلامی قانون کو رومن لاء اور انگلش لاء سے برتر اور بہتر قرار دیتے ہیں۔ گیلوے کا موقف یہ ہے کہ مسٹر مل سچائی تک نہیں پہنچ سکے۔ کیونکہ انگریزی زبان میں اسلامی قانون کا کیا گیا ترجمہ اس قانون کی درست تفہیم میں مدد نہیں دے سکتا۔ گیلوے کے خیال میں اسلامی قانون کے متن کی قطعیت اور حقانیت شاندار ہے لیکن اسے انگریزی ترجمے سے نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ انگریزی زبان کسی اصطلاح کے عربی زبان کی طرح قطعی معنی دینے کے قابل ہی نہیں ہے۔ گیلوے کا کہنا ہے کہ عربی زبان کی ساخت ایسی ہے کہ وہ گرائمر اور منطقی استدلال کے باب میں زیادہ کامل اور زیادہ موزوں ہے اور اسی نکتے میں اس قدیم زبان کا بنیادی کمال پوشیدہ ہے۔[26] چنانچہ گیلوے لکھتے ہیں کہ اگر مسٹر مل نے محمڈن لاء کو عربی زبان میں اس کے اصل متن میں پڑھا ہوتا تو اسلامی قانون کی یہ برتری ان سے اوجھل نہ رہ پاتی۔[27]

[24] مسٹر مل سے یہاں مراد جیمز مل ہیں۔ جنہوں نے The History of British India لکھی جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ 1818ء میں شائع ہوئی۔ یہ وہ پہلے مورخ تھے جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کر کے اس کا جائزہ لیا۔ یعنی ہندو، مسلم اور برطانوی دور۔

[25] ایضاً، 288۔

[26] ایضاً، 288-289۔

[27] ایضاً، 289۔

ان کے خیال میں اسلام کا نظام قانون غیر معمولی ہے۔ ان کا کہنا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ نظام قانون اور فلسفہ قانون کے باب میں اسلامی نظام کے برابر کوئی دوسرا نظام نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بعض معاملات مین انگلش لاء بھی اس سے بہت پیچھے ہے۔[28]

آرچی بیلڈ گیلوے لکھتے ہیں کہ مسٹر مل نے مجھے اسلامی نظام قانون کا پرجوش حامی قرار دیا ہے۔ ہو سکتا ہے اسلامی نظام قانون کے بارے میں میری رائے جانب دارانہ ہو لیکن معاملہ یہ ہے کہ محمڈن لاء کے بارے میں میرا جو علم ہے وہ مجھے اس قابل بناتا ہے کہ میں اس کی خوبیوں کی تحسین کر سکوں، یہی علم مجھے اس قابل بھی بناتا ہے کہ میں یہ دیکھ سکوں یہ ان نقائص سے پاک ہے جو اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔[29]

آرچی بیلڈ گیلوے کے خیال میں اسلامی قانون کے فہم و ادراک کی اہمیت لامحدود ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر ان کے خیالات کے مطالعے سے ہندوستان کے لیے قانون بنانے اور اسے نافذ کرنے والے برطانوی فیصلہ ساز اسلامی قانون کے مطالعے کی طرف راغب ہو سکیں تو انھیں اس پر بہت خوشی ہوگی۔ کیونکہ اسلامی قانون کا مطالعہ اگر محض ایک علمی مشق کے طور پر بھی کیا جائے تب بھی یہ بہت قیمتی اور سود مند ثابت ہوگا۔ گیلوے کے خیال میں کوئی شخص توجہ کے ساتھ محمڈن لاء کے کسی مسودے کا مطالعہ کرے تو ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے نتیجے میں اس کی قوت استدلال میں بہتری واقع نہ ہو۔[30]

28 ایضاً، 290۔

29 ایضاً۔

30 ایضاً، 291۔

یہ وہ دور تھا جب برطانوی قوانین کا پھیلاؤ برصغیر میں شروع ہو چکا تھا۔ آرچی بیلڈ گیلوے اس تصور کے بھی ناقد تھے۔ وہ برطانوی قانون کو ہندوستان میں ٹرانسپلانٹ کرنے کی حکمت پر سوال اٹھاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ انگریزوں کے پاس، فی الحقیقت، کوئی باقاعدہ ضابطہ قانون نہیں ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

"The English have, in fact, no regular code of law."[31]

گیلوے کہتے ہیں کہ انگریزوں کے پاس تحریری قوانین تو بلاشبہ کثرت سے ہیں لیکن وہ بہت سے لوگوں کے لیے ناقابل فہم ہیں۔ اکثر قوانین بدلے جا چکے ہیں یا جزوی طور پر منسوخ ہو چکے ہیں اور بہت سارے ایسے ہیں جو مکمل طور پر کالعدم قرار دیے جا چکے ہیں اور صورت حال یہ ہے کہ انگریز جنٹل مین کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ قانون کہاں سے تلاش کرے۔ چنانچہ ہر موقع پر وہ مجبور ہوتا ہے کہ قانون سمجھنے کے لیے کسی پریکٹیشنر (وکیل) سے رجوع کرے۔[32]

گیلوے کا نکتہ اعتراض یہاں ختم نہیں ہوتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب ایک عام آدمی انگریزوں کا قانون سمجھنے کے لیے کسی پریکٹیشنر کے پاس جاتا ہے تو وہ پریکٹیشنر انھیں برطانوی قانون سازوں کے بنائے کسی باقاعدہ قانونی مسودے کی طرف رجوع نہیں کراتا بلکہ وہ انھیں ان فیصلوں کی طرف لے جاتا ہے جو مختلف عدالتوں میں مختلف جج صاحبان نے دے رکھے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جج تو بے شک دانا ہوتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عقل

31 ایضاً۔

32 ایضاً، 290۔

دانش کا مجموعہ نہیں ہوتے۔ لیکن ان کے فیصلے برطانیہ کا قانون قرار پاتے ہیں۔[33]

گیلوے کے نزدیک کامن لاء کا یہ بنیادی تصور ہی ناقص اور غلط ہے۔ دل چسپ یہ ہے کہ برطانوی قانون کھڑا ہی اسی تصور پر ہے اور اسے عدالتی نظیر (Precedent) کہا جاتا ہے۔ گیلوے اس تصور کے ناقد ہیں۔ ان کے خیال میں جج کا کام دستیاب قانون کا اطلاق ہے۔ جج کا کام قانون سازی کرنا نہیں۔ قانون سازی پارلیمان کا کام ہے۔ اس تصور کو وہ نظام قانون کی ساری ترتیب الٹ دینے کے مترادف تصور کرتے ہیں۔[34]

آرچی بیلڈ کی رائے میں یہ انتہائی نامناسب سی بات تھی کہ برطانوی قانون کو ہندوستان میں نافذ کیا جاتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسلامی قانون پر مسٹر مل یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بہت سے لوگ اس سے واقف نہیں تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان کے لوگ برطانوی قانون سے واقف ہیں کہ اسے یہاں نافذ کر دیا جائے اور کیا خود برطانیہ کے شہری برطانوی قوانین سے آگہی رکھتے ہیں؟[35]

اس ساری بحث کے بعد آرچی بیلڈ لکھتے ہیں کہ سوال اب یہ ہے کہ ہندوستان میں کون سا قانون نافذ کیا جائے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ 'میں بلا تامل فوری پر جواب دوں گا کہ محمڈن لاء۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ وقت کے تقاضوں کے مطابق اس قانون میں جہاں ضروری سمجھتے ہیں تبدیلی کر لیں لیکن ہندوستان میں کوئی نظام قانون اگر کامیابی سے چل سکتا ہے تو

33 ایضاً، 292۔

34 ایضاً، 292۔

35 ایضاً، 315۔

وہ صرف اسلامی نظام قانون ہے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ برطانوی قوانین برطانیہ کے لیے جتنے بھی فائدہ مند کیوں نہ ہوں، برصغیر میں ان قوانین کو نافذ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے مسائل پیدا ہوں گے۔[36]

اتفاقات زمانہ دیکھیے، ایک طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیئرمین کے منصب پر فائز رہنے والا برطانوی میجر جنرل لکھ رہا ہے کہ برصغیر کے لیے اسلامی نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں کیونکہ یہ یہاں صدیوں سے کامیابی کے ساتھ نافذ العمل ہے اور دوسری جانب ہم خود ہیں جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ رنجیت سنگھ اور پھر انگریزوں کی آمد سے پہلے یہاں نہ تو کوئی قانونی عدالتیں تھیں نہ ہی تحریری قوانین موجود تھے اور نہ ہی ان کو برقرار رکھنے یا نافذ کرنے کا کوئی مستند اور بااختیار ادارہ تھا۔

برصغیر میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کے نفسیاتی اثرات غیر معمولی ہیں۔ سماج کے اہل الرائے خود شکستگی کا شکار ہو چکے اور وہ اپنی مقامی تہذیب کے ہر رنگ پر شرمندہ شرمندہ سے پھرتے ہیں۔ یہ ایک فکری اور نفسیاتی پسپائی ہے جس نے ہمیں توازن سے محروم کر دیا ہے۔ توازن یہ ہوتا ہے کہ احساس کمتری یا احساس برتری کا شکار ہوئے بغیر معروضیت اور اعتماد کے ساتھ چیزوں کو ان کی ترتیب پر رکھ کر دیکھا جائے۔ احساس برتری کی نفسیات خود میں کسی غلطی اور دوسرے میں کسی خوبی کے امکان کو تسلیم نہیں کرتیں اور احساس کمتری یہ بات ماننے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ خود میں کوئی خوبی بھی ہو سکتی ہے اور دوسرے میں کسی خامی کا امکان بھی موجود ہو سکتا ہے۔ توازن کی راہ ہی اعتدال کی راہ ہے۔

36 ایضاً۔

ایک متوازن اور پر اعتماد سماج خوبیوں اور خامیوں، ہر دو باب میں، ہر دو امکانات کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ خود میں اور دوسرے میں نہ خوبی کے امکان کو رد کرتا ہے نہ خامی کے احتمال کی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ یہی رویہ شعور انسانی کو ارتقا کی طرف لے جاتا ہے اور اسے منجمد نہیں ہونے دیتا۔ وہ یہ سوچ کر خود شکستگی کا شکار نہیں ہوتا کہ اس میں تو خامیاں ہی خامیاں ہیں اور وہ یہ سوچ کر شعور کے ارتقائی دھارے سے کٹ نہیں جاتا کہ اس کے سوا تو سب ہی غلط ہیں۔ وہ اپنی تہذیبی قدروں سے بھی جڑا رہتا ہے اور دوسری تہذیب کے آگے شکست خوردہ نہیں ہو جاتا لیکن وہ دوسری تہذیب کی کامل نفی بھی نہیں کرتا اور اس کی خوبیوں کو شعور انسانی کا اجتماعی ورثہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے اور یوں انسانی فکر کے سفر میں دنیا کے ساتھ چلتا ہے۔ آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہی کام نشاۃ ثانیہ کے دور میں یورپ نے کیا تھا۔

برصغیر میں تہذیب انسانی کا آغاز برطانوی نو آبادیات سے نہیں ہوتا۔ نہ ہی برصغیر میں قانون، عدالت اور انصاف کی شروعات برطانوی نو آبادیاتی دور میں ہوئیں۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جس میں جدت بھی آتی رہتی ہے اور ارتقا بھی ہوتا رہتا ہے۔ ایک زندہ سماج وقت کے تقاضوں کو اپنے قدروں سے ہم آہنگ کر کے اپنا لیتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ نظام فطرت ہے۔ لیکن معاشرے کا غالب رجحان ہی اگر ''ملامتی تصوف'' کی طرف مائل ہو جائے اور وہ سمجھ لے کہ ہم تو اس زمین کا بوجھ ہیں، ہم تو تہذیب و اقدار سے عاری تھے، یہ تو سفید فام اقوام نے شفقت فرمائی کہ ہمیں اپنی کالونی بنایا اور وہ حق الیقین کی حد تک یکسو ہو جائے کہ ہمارے سماج میں مہذب معاشرت کا آغاز برطانوی نو آبادیاتی نظام سے ہوتا ہے اور اس سے پہلے تو برصغیر قانون و انصاف کے باب میں دور جاہلیت میں رہ رہا تھا تو اس رویے کا دلیل اور علم کی دنیا میں کوئی اعتبار نہیں۔

باب چہارم

پولیس: پاکستان کی یا ملکہ وکٹوریہ کی؟

فوجداری نظام قانون کا ایک اہم جزو پولیس ہے۔ آزادی کے پچھتر (75) سال بعد بھی ہماری پولیس اسی ڈھانچے اور اسی قانون کے تحت کام کر رہی ہے جو 1857ء کی جنگ آزادی کچلنے کے تین سال بعد برطانیہ نے اس سوچ کے تحت قائم کیا تھا کہ آئندہ یہاں کسی کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہو۔ یہ قانون شہریوں کے لیے نہیں تھا، یہ محکوم رعایا کے لیے تھا۔ اس کا مقصد حصول انصاف نہیں تھا، اس کا مقصد برطانوی سامراج کی گرفت کو مستحکم رکھنا تھا۔

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب معاملات ایسٹ انڈیا کمپنی سے برطانیہ نے براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیے تو 1860ء میں اس نے ایک پولیس کمیشن بنایا اور اس کی سفارشات کی روشنی میں 1861ء میں پولیس ایکٹ نافذ کیا گیا۔ آج 161 سال بعد بھی، عملاً ہم اسی قانون سے ہانکے جا رہے ہیں۔ اس دورانیے میں ہمارے ہاں اصلاحات کے نام پر پولیس آرڈر کے عنوان سے کچھ رفو گری کرنے کی کوشش کی گئی لیکن پولیس کا بنیادی ڈھانچہ آج بھی وہی ہے جو پولیس ایکٹ، 1861ء میں طے کر دیا گیا تھا۔ پنجاب پولیس کی ویب سائٹ پر اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ہم آج بھی اسی ڈھانچے کے تحت کام کر رہے ہیں جو پولیس ایکٹ، 1861ء میں وضع کیا گیا تھا۔[1]

[1] پنجاب پولیس کی ویب سائٹ پر دیکھیے: punjabpolice.gov.pk/pphistory

پولیس ایکٹ، 1861ء اپنے مزاج میں آمرانہ تھا اور اس کے تحت جو محکمہ پولیس وجود میں آیا اس کا مقصد عوام کا تحفظ نہیں بلکہ سامراجی قوت کا تحفظ تھا۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام کی یہ پولیس رائل آئرش کانسٹیبلری کی طرز پر قائم کی گئی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف بھی پنجاب پولیس کی ویب سائٹ پر اس کے تعارف میں موجود ہے اور لکھا ہے کہ سر چارلس نیپیئر نے آئرش کانسٹیبلری سے متاثر ہو کر پولیس کا یہ ڈھانچہ استوار کیا۔[2]

آئرش کانسٹیبلری آئرلینڈ کی جنگ آزادی کو کچلنے کے لیے بنائی گئی تھی اور یہ پولیس 1857ء کی جنگ آزادی کو کچلنے کے بعد بنائی گئی تھی۔ آئرش کانسٹیبلری میں بھی رینک کانسٹیبل سے شروع ہوتا تھا اور آئی جی تک جاتا تھا۔ پولیس میں بھی بعینہ یہی ڈھانچہ متعارف کرایا گیا۔

معروف مؤرخ. سین گینن نے لکھا ہے کہ یہ آئرش کانسٹیبلری بین الاقوامی سطح پر ایک بد نام ادارہ تھا اور اس Gang of Thugs کو بعد میں فلسطین بھیجا گیا تاکہ وہ وہاں عربوں سے نبٹ سکے۔ سین گینن نے لکھا کہ ان کو فلسطین بھیجنے سے پہلے ہی وہاں ایک ہوا کھڑا کر دیا گیا کہ Black and Tans کی فورس تمہارے لیے منگوائی جا رہی ہے تاکہ تم عربوں کو سیدھا کیا جا سکے۔[3] یہی رائے یونی ورسٹی آف لیمرک کے تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر برائن ہیوز کی ہے کہ ان کو فلسطین بھیجنے سے پہلے ہی ایک منظم پروپیگنڈے کے ذریعے وہاں کے عرب

[2] ایضاً۔

[3] نیال گلن، "The controversial Irish Force sent to police Palestine"، بی بی سی نیوز، 23 جنوری، 2022ء۔

باشندوں میں خوف پیدا کیا گیا۔[4]

اس آئرش کانسٹیبلری کے ڈھانچے سے متاثر ہو کر سر چارلس نیپیئر نے جو پولیس سندھ میں متعارف کرائی اور جسے 1857ء کی جنگ آزادی کو کچلنے کے بعد پورے ہندوستان میں کھڑا کر دیا گیا، اس کے رویے اور اس کی کارکردگی پر ہمارے سماج میں ہمیشہ ہی شکوے اور افسوس کی سی کیفیات رہی ہیں۔ لیکن یہ بنیادی حقیقت نظروں سے اوجھل رہی ہے کہ جو پولیس قائم ہی آمرانہ انداز سے، سامراجی قوت کے تحفظ اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے آئرش کانسٹیبلری جیسے قوت سے متاثر ہو کر کی گئی ہو، اس سے آپ کسی بہتری کی توقع کر ہی کیسے سکتے ہیں؟

پولیس ایکٹ 1861ء سے پہلے ایک پولیس کمیشن بنایا گیا تھا۔ اس کمیشن نے تجویز کرنا تھا کہ اب جب کہ مغل سلطنت کا خاتمہ ہو چکا ہے اور بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون کے ایک گیراج میں بند کر دیا گیا ہے تو اب یہاں مفتوح رعایا کے لیے کیسی پولیس قائم کی جائے۔ یہ ایک غالب قوت ایک محکوم ملک پر اپنا آمرانہ تسلط برقرار رکھنے کے لیے اقدامات تجویز کر رہی تھی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس چھ رکنی کمیشن میں ایک بھی آدمی مقامی نہیں تھا۔ اس پورے نظام میں مقامی لوگوں کی کوئی شرکت تھی نہ ہی انھیں مشاورت کے قابل سمجھا گیا۔ مقامی آبادی کی فلاح مقصود ہی نہ تھی۔ ایسا ہوتا تو ان کی مشاورت بھی شامل ہوتی اور ان سے بھی پوچھا جاتا کہ آپ کے سماج میں ایک فعال اور مستعد پولیس کا نظام قائم کرنے کے لیے کن عوامل کو مدنظر رکھا جانا چاہیے۔

[4] ایضاً۔

یہاں مقصد صرف یہ تھا کہ جنگ آزادی کو کچلا جا چکا تھا اور اب مفتوحہ علاقوں میں ایسا بندوبست قائم کرنا ضروری تھا کہ یہ رعایا آئندہ کبھی بھی 1857ء جیسی 'بغاوت' کا سوچ بھی نہ سکے۔ معاشرے میں رول آف لاء مقصود نہ تھا۔ مطلوب یہ تھا کہ ایک ایسی پولیس قائم کی جائے جو غیر ملکی حکمرانوں کے لیے سیاسی طور پر فائدہ مند اور ان کے اقتدار کے تحفظ میں ایک عامل کا کردار ادا کرے۔ چنانچہ یہ اتفاق نہیں تھا بلکہ اہتمام تھا کہ یہ پولیس اسی ڈھانچے پر کھڑی کی گئی جو آئرلینڈ کی جنگ آزادی کو کچلنے والی آئرش کانسٹیبلری کا تھا۔

یہاں مناسب ہو گا اگر ہم ایک جائزہ لے لیں کہ برطانوی نوآبادیاتی نظام میں تشکیل پانے والی پولیس سے پہلے یہاں کوئی نظام ہوتا تھا یا نہیں، کوئی ادارہ تھا یا نہیں اور کوئی قوت نافذہ موجود تھی یا نہیں اور اگر سب کچھ موجود تھا تو اس کی نوعیت کیا تھی۔ پولیس کمیشن، 1902ء کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ مغلوں کے زمانے میں یہاں پولیس کا جو نظام تھا، وہ زمینداری (Land Tenure) کے اصول پر چل رہا تھا اور یہ بالکل ویسا ہی نظام تھا جیسے سیکسن انگلینڈ میں کنگ الفریڈ کے زمانے میں پولیس کا نظام تھا۔[5]

اس رپورٹ میں یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ مغلوں نے پولیس کا جو نظام یہاں تشکیل دے رکھا تھا، وہ یہاں کے لوگوں کی ضروریات اور مسائل کے حوالے سے بلاشبہ ایک مناسب ترین نظام تھا۔ یاد رہے کہ جو کمیٹی اپنی رپورٹ میں یہ اعتراف کر رہی ہے کہ مغلوں کا نظام پولیس اس خطے کی ضروریات کے حوالے سے 'بلاشبہ موزوں ترین' نظام تھا اس کمیٹی میں کوئی بھی مسلمان شامل نہیں تھا۔ اس کمیٹی کے صدر سر اینڈریو ایچ ایل فریزر تھے جو مغربی

[5] پولیس کمیشن رپورٹ 1902ء (شملہ: گورنمنٹ سنٹرل پرنٹنگ آفس، 1903)، 4۔

بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر رہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس خطے پر تحقیق کے لیے بنائی گئی ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔ اس کے ممبران میں مسٹر جسٹس کینڈی، مہاراجہ آف دربھانگہ، دیوان بہادر ایس سری نیواسا، لیفٹیننٹ کرنل جے اے ایل منٹگمری، ڈبلیو، ایم کول ون اور اے سی ہنکن شامل تھے اور اس کے سیکرٹری ایچ اے سٹیورٹ تھے۔

اس کمیٹی نے اپنی اسی رپورٹ میں یہ بھی بتایا ہے کہ یہ مغلوں کا پولیس کا نظام جو اتنا اچھا، شاندار اور یہاں کے لوگوں کی ضروریات اور مسائل کے حوالے سے ایک مناسب ترین نظام تھا اسے بدلنے کی ضرورت کیوں آن پڑی تھی۔ ایسا بھی تو ہو سکتا تھا کہ اسی نظام کو کچھ ضروری تبدیلیوں کے ساتھ جاری رکھا جاتا۔ آخر یہ نظام یہاں کے لوگوں کی ضروریات اور مسائل کے حوالے سے ایک مناسب ترین نظام تھا۔ ایسی کیا مجبوری آن پڑی کہ اس نظام کو ختم کر کے آئرش کانسٹیبلری جیسی فورس کھڑی کر دی گئی؟

کمیٹی نے لکھا کہ اس نظام میں ایک بڑی خامی تھی کہ یہ سیاسی ضروریات پوری نہیں کر سکتا تھا۔ ذرا کمیٹی کے الفاظ پڑھ لیجیے:

"It could not support the strain of political order and restoration of the control from above."[6]

یعنی مغلوں کے پولیس کے نظام کی دو بڑی خامیاں یہ تھیں۔ ایک سامراجی قوت کے تسلط قائم رکھنے میں موثر نہ ہونا اور دوسرا سیاسی ضروریات کی تکمیل میں معاون نہ ہونا۔ کمیٹی نے یہ نہیں کہا کہ یہ نظام ناکام ہو گیا تھا یا یہ لوگوں کو ریلیف نہیں دے پا رہا تھا۔ یقیناً اس نظام میں بھی کئی خامیاں

[6] پولیس کمیشن رپورٹ 1902ء، 5۔

ہوں گی اور بے شک وقت کے ساتھ ساتھ ان میں بھی اصلاح کی ضرورت ہو گی لیکن برطانوی نو آبادیات کی ترجیحات میں عوام کی فلاح یا اس نظام میں اصلاح کا جذبہ کہیں تھا تو ثانوی تھا یا برائے وزن بیت تھا۔ اصل اور اولین ترجیح سامراجی تسلط کا تحفظ تھا۔

بنیادی ہدف واضح تھا۔ ایک ایسی پولیس کی تشکیل جو برطانوی سامراج کے مفادات کا تحفظ کر سکے اور اس کی سیاسی ضروریات کی تکمیل میں آلہ کار کا کردار ادا کر سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے آئرش کانسٹیبلری کا ماڈل یہاں متعارف کرایا گیا حالانکہ سکاٹ لینڈ یارڈ پولیس کا ماڈل بھی دستیاب تھا لیکن وہ یہاں متعارف نہیں کرایا گیا۔ ترجیح اگر جرائم کا خاتمہ اور عوام کا تحفظ ہوتا تو 1829ء اور 1839ء کے میٹرو پولیٹن پولیس ایکٹ سے بھی رجوع کیا جا سکتا تھا جو برطانیہ میں نافذ کیے گئے تھے۔ مقصد چوں کہ مختلف تھا، اس لیے قانون سازی اور پولیس ماڈل کے تعین میں وہی راستہ اختیار کیا گیا جو اس مقصد کے حصول میں فائدہ مند ہو سکتا تھا۔ دعوے تو یہ تھے کہ سفید فام اقوام "White Man's Burden" کے تحت دیگر اقوام کو مہذب بنانے نکلی ہیں لیکن عمل ان دعووں کی توثیق نہیں کرتا۔

برطانوی نو آبادیاتی نظام سے پہلے مغلوں کا پولیس کا نظام مختلف خطوط پر استوار تھا۔ پولیس کمیشن 1902ء کی رپورٹ میں شہنشاہ اکبر کے وزیر ابوالفضل کے ایک حکم نامے کا اقتباس دیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ہندوستان میں پولیس کا نظام کیسا تھا۔ اس فرمان میں لکھا ہے کہ دیہاتوں، قصبوں، محلوں اور شہروں کے تمام کوتوال ایک رجسٹر تیار کریں گے اور اس رجسٹر میں تمام گھروں، ان کے مکینوں اور عمارتوں کی تفصیل ہو گی۔ ہر گھر دوسرے گھر کی سیکیورٹی کا کام کرے گا اور ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کرے گا۔ علاقے انتظامی طور پر تقسیم ہوں گے اور ہر ضلع کا ایک سربراہ ہو گا۔ ہر ضلع میں خفیہ انٹیلی جنس اور جاسوسوں کا ایک نظام ہو گا جن کے پاس مقامی

سطح پر ہونے والے ہر وقوعے کی تفصیل کے ساتھ وہاں آنے اور جانے والوں کا ریکارڈ بھی رکھا جائے گا۔ چاہے وہ دن میں آئیں یا چاہے رات میں آئیں، ہر دو صورتوں میں ریکارڈ رکھنا لازم ہے۔ جب کوئی چوری ہو یا آگ لگے یا کوئی اور حادثہ ہو تو پڑوسی اس بات کے پابند ہوں گے کہ فوری طور پر مدد کو پہنچیں۔ مقامی انتظامی افسر اور مخبروں (Informers) کا ایسے موقع پر فوری طور پر جائے وقوعہ پر پہنچنا لازمی ہو گا اور کوتاہی کرنے پر ان سے بازپرس ہو گی۔ کسی شخص کو کسی ضلع کی حدود میں داخل ہونے یا اس سے نکلنے کی اس وقت تک اجازت نہیں ہو گی جب تک وہ اس بابت متہم کو، پبلک انفارمرز کو یا پڑوسیوں کو مطلع نہ کرے۔ ہر ضلع میں کچھ لوگوں کی ذمہ داری لگائی جائے گی کہ وہ شہروں، گلیوں اور سڑکوں پر رات کو گشت کریں۔ کہیں چوری ہو جائے تو مقامی پولیس کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ چور کو پکڑے اور چوری کا مال مالک کو واپس دلائے۔ اگر پولیس اس میں ناکام ہو جائے تو چوری کے مال کے برابر رقم پولیس سے وصول کی جائے گی اور مالک کو دی جائے گی۔[7]

مغل دور کی پولیس کے بارے میں زیادہ بہتر تفصیل ہمیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق چیئرمین آرچی بیلڈ گیلوے کی کتاب میں ملتی ہے۔ گیلوے نے آئین اکبری سے شہنشاہ اکبر کا وہ فرمان نقل کیا ہے جس میں پولیس کے لیے ضابطہ کار موجود ہے اور اس کی ذمہ داریوں اور اس کے دائرہ عمل اور اختیار کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ فرمان ہمیں بتاتا ہے کہ امن عامہ قائم رکھنے کے لیے مغلوں کا انتظامی ڈھانچہ کیسا ہوتا تھا۔ اس فرمان کے مطابق:[8]

---

[7] آرچی بیلڈ گیلوے 432-433۔

[8] پولیس کمیشن رپورٹ، 1906ء، 4۔

1. پولیس کے مقامی سربراہ یعنی کوتوال کے عہدے پر فائز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ متعلقہ آدمی دلیر ہو، تجربہ کار ہو، متحرک ہو، اور چیزوں کو جلد سمجھ لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔
2. کوتوال کے لیے ضروری ہے کہ راتوں کو گشت کی حساسیت کو سمجھتا ہو تاکہ راتوں کو لوگ اس اطمینان کے ساتھ سکون کی نیند سو سکیں کہ کوتوال نگرانی کے لیے موجود ہے۔
3. کوتوال کا یہ فرض ہو گا کہ وہ ایک ایسا رجسٹر رکھے جس میں وہ تمام گھروں اور آمد و رفت والی سڑکوں کی تفصیل درج کرے۔ کوتوال کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ سب لوگوں کو یوں جوڑ کر رکھے کہ وہ ایک دوسرے کی خوشی اور غمی میں شریک ہوں اور ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ضرورت ہو تو ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔
4. کوتوال کی ذمہ داری ہو گی کہ شہروں کو محلوں اور وارڈز میں تقسیم کرے اور وہاں ہر محلے اور وارڈ کا ایک مناسب اور موزوں آدمی نگران اور منتظم (میر محلہ) مقرر کرے۔
5. میر محلہ ہر روز اپنی مہر اور دستخطوں سے کوتوال کو اس محلے کی تفصیلی رپورٹ بھیجے گا جس میں ہر اہم واقعہ درج ہو گا اور یہ تفصیل بھی موجود ہو گی کہ اس محلے میں کون آیا اور کون گیا۔
6. میر محلہ من مانی نہیں کرے گا بلکہ اس کے طرز عمل کی بھی نگرانی ہو گی اور کوتوال کا یہ فرض ہو گا کہ وہ میر محلہ پر دو جاسوس مقرر کرے گا۔ ایک جاسوس وہاں کا مقامی آدمی ہو گا اور دوسرا ایک ایسا آدمی جسے وہ جانتا ہی نہ ہو۔ یہ جاسوس میر محلہ کی رپورٹ تحریری طور پر کوتوال کو دیا کریں گے۔
7. اجنبی مسافروں کو سیدھا سرائے میں لے جا کر اتارا جائے گا اور ان کی نگرانی کر کے انٹیلی جنس کے ذریعے معلوم کیا جائے گا کہ وہ کون ہیں اور کیوں آئے ہیں۔

8. کوتوال کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ ہر آدمی کے ذرائع آمدن سے آگاہ رہے (تاکہ وہ ان ذرائع سے زیادہ بہتر زندگی گزار رہا ہو تو معلوم ہو سکے)۔ کوتوال کا یہ بھی فرض ہو گا کہ وہ اپنے علاقے میں ہونے والے ہر کاروباری سودے سے آگاہ رہے۔
9. ہنر مندوں میں سے وہ کسی ایک کو ان کا سربراہ بنائے گا اور کسی ایک کو ان کی اشیا کی خرید و فروخت کے لیے ان کا ایجنٹ مقرر کرے گا۔ یہ دونوں شخص کوتوال کو تحریری رپورٹ پیش کیا کریں گے اور وہ ان رپورٹس کی روشنی میں ان کے کاروبار کو ریگولیٹ کرے گا۔
10. سڑکوں اور گلیوں کو صاف کروانا بھی اس کی ذمہ داری ہو گی۔
11. شہر کے داخلی راستوں پر ناکے لگائے جائیں گے اور کوتوال اس بات کو یقینی بنائے گا کہ رات کے اوقات میں کوئی شخص شہر میں داخل ہو سکے نہ شہر سے باہر جا سکے۔
12. کوتوال کی ذمہ داری ہو گی کہ بے کار لوگوں کو کوئی ہنر سیکھنے میں لگائے۔
13. کوتوال کسی کو بھی کسی دوسرے کے گھر میں زبردستی داخل ہونے سے روکے گا اور چار دیواری کا تقدس پامال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔
14. کہیں چوری ہو جائے تو کوتوال کی یہ ذمہ داری ہو گی کہ چور کو پکڑے اور مال مسروقہ برآمد کر کے اصل مالک کو پیش کرے۔
15. اگر کوتوال مال مسروقہ کی تلاش میں ناکام رہتا ہے تو چوری کے مال کی قیمت اپنی جیب سے اس کے مالک کو ادا کرے گا۔
16. کوتوال مارکیٹ کی بھی نگرانی کرے گا اور اس بات کو یقینی بنائے گا کہ اشیا کی قیمتیں اعتدال میں رہیں۔ اگر اشیا کی قیمتیں بڑھ جائیں اور لوگوں کو خریداری کے لیے کہیں اور جانا پڑے تو یہ کوتوال کی نااہلی سمجھی جائے گی اور اس سے باز پرس ہو گی۔

17. کوتوال اس بات کو بھی یقینی بنائے گا کہ مارکیٹ میں مصنوعی قلت پیدا نہ ہو اور کوئی امیر شخص اپنی ضرورت سے زیادہ اشیا نہ خرید سکے۔
18. مارکیٹ میں اوزان کو چیک کرنا بھی کوتوال کی ذمہ داری ہوگی۔
19. کوتول کو اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اس تجسس میں پڑا رہے کہ لوگ اپنے گھروں میں کیا کر رہے ہیں۔
20. کوتوال کا فرض ہوگا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ کوئی کسی کو حبس بے جا میں نہ رکھے اور کوئی کسی کو غلام نہ بنائے۔
21. کوتوال مذہبی جعل ساز ملنگوں اور قلندروں کو شہر سے نکال دے گا یا انھیں کہے گا کہ وہ یہ طرز زندگی چھوڑ دیں۔
22. البتہ کوتوال کو ایسے لوگوں کو تنگ کرنے کی اجازت نہیں ہوگی جو مذہبی نکتہ نظر سے تارک الدنیا ہو کر غربت کی زندگی گزار رہے ہوں۔

اس قدر ذمہ داریوں کے ساتھ کوتوال کی تنخواہ بھی غیر معمولی تھی۔ برطانیہ کے بنائے گئے پولیس کمیشن، 1900ء کی رپورٹ کے مطابق مغل دور میں کوتوال کی تنخواہ نو ہزار روپے تھی۔[9] جب کہ برطانوی نوآبادیاتی نظام کے تحت جب پولیس قائم کی گئی تو اس کی تنخواہ انتہائی کم تھی۔ مغل اقتدار کے خاتمے کے چار عشرے بعد یعنی 1900ء میں ایک کانسٹیبل کی ماہانہ تنخواہ صرف سات روپے تھے (سات سو نہیں، صرف سات روپے)۔ انسپکٹر جنرل، یعنی آئی جی جو اس

9 ڈیوڈ آرنلڈ، ''Police and colonial control in south India''، سوشل سائنٹسٹ (1976ء)، 4:16-3۔

فورس کا سب سے بڑا منصب تھا، کی ماہانہ تنخواہ پچیس سو روپے تھی۔[10] یعنی 1560ء میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر اپنے کوتوال کو جو تنخواہ دے رہے تھے وہ 1900ء میں برطانوی پولیس کے آئی جی کی تنخواہ سے قریب ساڑھے تین سو فیصد زیادہ تھی۔ معروف ادیب جارج آرول جب ہندوستان میں برطانوی پولیس میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے تو ان کی تنخواہ پانچ سو پچیس روپے ماہانہ تھی،[11] یعنی مغلوں کے کوتوال کی تنخواہ سے 18 گنا کم۔

آرچی بیلڈ گیلوے نے شہروں کی طرح دیہی پولیس اور وہاں امن عامہ برقرار رکھنے کے مغل دور کے انتظامی ڈھانچے کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ یہ وہی انتظام ہے جس کے بارے میں برطانوی پولیس کمیشن نے 1902ء کی رپورٹ میں لکھا کہ یہ برطانوی بادشاہ الفریڈ کے نظام سے مماثلت رکھتا تھا۔ آرچی بیلڈ گیلوے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پورے ملک میں جہاں جو زمین دار ہوتا تھا اپنے علاقے میں پولیس کا کام وہی کرتا تھا۔ زمینداروں کو بادشاہ کی جانب سے زمین داری کی جو سند دی جاتی تھی اس میں باقاعدہ درج ہوتا تھا کہ پولیس کا کام آپ نے کرنا ہے، جرائم کو روکنا اور لوگوں کی حفاظت آپ کی ذمہ داری ہوگی۔ امن عامہ کا قیام اس کی بنیادی شرط ہوتی تھی۔ اس کام کے لیے مقامی سطح پر ایک باقاعدہ فورس بھی تیار کی جاتی تھی۔

یہ زمین ان زمین داروں کو عارضی طور پر، ان کے منصب سے جڑے فرائض کی ادائیگی

10 ایضاً۔

11 آرچی بیلڈ گیلوے، 435۔

کے معاوضے اور اس کے لیے ناگزیر وسائل کے حصول کے لیے دی جاتی تھی۔ جب ایسا کوئی شخص ایسے کسی منصب سے معزول کر دیا جاتا تو اس سے زمین لے لی جاتی۔ کسی صاحب منصب کے انتقال پر یہ زمین اس کے ورثا کو نہیں دی جاتی تھی اور نہ ہی یہ ان کا موروثی حق قرار پاتی بلکہ یہ نئے صاحب منصب کو منتقل ہو جاتی۔

مستقل بنیادوں پر زمین بانٹنے کا عمل انگریز نے شروع کیا اور اس نے ان نو مولود جاگیرداروں کے لیے یہ ضابطہ بھی وضع کیا کہ اس جائیداد میں ان کی بیٹیاں حصہ نہ لے سکیں۔ یہی وہ جاگیرداری نظام ہے جس کے شکنجے سے پاکستانی معاشرہ آج تک آزاد نہیں ہو سکا۔

گیلوے نے بادشاہ اکبر کا ایک 'فرمان زمینداری' بھی نقل کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ

زمین دار کے علاقے سے جو سڑک گزرتی ہیں اسے محفوظ بنانا اس کی ذمہ داری ہے۔ اس کا فرض ہے کہ سڑکوں کو محفوظ رکھے تاکہ لوگ اعتماد کے ساتھ سفر کر سکیں۔ تاہم خدانخواستہ اگر کوئی ڈکیتی یا چوری ہو جاتی ہے تو زمین دار کا فرض ہے ڈاکوؤں اور چوروں کو گرفتار کرے اور چوری ہونے والا یا چھینا گیا سامان مالک کو واپس کرے۔ اگر وہ چور اور ڈاکو تلاش کرنے میں ناکام رہتا اور مال مسروقہ برآمد کر کے مالک کو نہیں دیتا تو اس سامان کے برابر رقم کوتوال ہی سے وصول کی جائے گی۔[12]

یہ انتظام کتنا موثر تھا، اس باب میں ایک گواہی جان زیفینایا ہول ویل کی ہے۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرجن تھے اور 1760ء میں بنگال کے گورنر رہے۔ اورنگزیب عالمگیر نے 1707ء میں وفات پائی تو اس کے ساتھ ہی مغل سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ باقاعدہ اختتام تو 1857ء میں جا کر ہوا لیکن اس سے بہت پہلے مختلف علاقوں میں انگریزوں کی عملداری قائم ہو چکی

[12] آرچی بیلڈ گیلوے، 465۔

تھی۔ بھشن پورہ نام کے ایسے ہی ایک علاقے کے بارے میں، جہاں ابھی مقامی سطح پر رائج قدیم بندوبست کے ذریعے ہی معاملات چلائے جا رہے تھے، جان زیفینایا ہول ویل نے لکھا کہ قدیم حکومت کی سختی اور مساوات کے اصول ابھی تک رائج ہیں۔ لوگوں کی جائیداد اور آزادی محفوظ ہے۔ کبھی کسی ڈکیتی کا ذکر نہیں سنا گیا۔ مسافر ضلع میں داخل ہوتے ہی حکومت کی ذمہ داری بن جاتے ہیں۔ ان کو بلا قیمت محافظ فراہم کیے جاتے ہیں اور یہ اس کے تحفظ اور رہائش کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔[13]

جان زیفینایا ہول ویل کی اس گواہی میں آرچی بیلڈ گیلوے دو باتوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ پہلی بات وہ یہ لکھتے ہیں کہ یہ محض بھشن پورہ کا معاملہ نہیں، یہ اصل میں اس ملک کی روایت تھی۔ یعنی یہ مغلوں کے ہندوستان میں امن عامہ کے مسائل سے نبٹنے کی روایت تھی جسے قانون کا درجہ حاصل تھا۔ اور دوسری بات گیلوے یہ کہتے ہیں کہ زمین داروں پر عائد یہ ذمہ داری نہ صرف ضروری تھی بلکہ یہ ایک معقول فریضہ بھی تھی۔[14]

مغل پولیس کے نظام کے بارے میں اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن احساس کمتری کی گرہ کو کھولنے کے لیے یہ تین گواہیاں کافی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک گواہی بنگال کے گورنر کی ہے، دوسری گواہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیئرمین اور برطانوی میجر جنرل کی ہے اور تیسری گواہی برطانیہ کی اپنی اس کمیٹی کی ہے جس میں اس عہد کے برطانوی جسٹس صاحبان شامل تھے۔

مغلوں نے ہندوستان کو جس انتظامی حالت میں چھوڑا اس کے بارے میں آرچی

[13] آرچی بیلڈ گیلوے، 435۔

[14] ایضاً، 431۔

بیلڈ گیلوے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ یہ پہلے ہی سے ایک منظم معاشرہ ہے۔ کوئی ایسی کمیونٹی نہیں جو اپنے سربراہ کے بغیر ہو۔ کوئی ایسا موضع یا محلہ نہیں جو کسی منڈل اور مقدم کے بغیر ہو۔ کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا کوئی چودھری یا سردار نہ ہو، اور جو چیز ہمارے لیے زیادہ فائدہ مند ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی ایک ایسا گاؤں نہیں جس کا کوئی چوکیدار نہ ہو۔ چنانچہ اس نظام کی بنیاد پر ایک شاندار پولیس کھڑی کی جاسکتی ہے۔[15]

سلطنت مغلیہ کے پولیس کے ڈھانچے کی وضاحت کرتے ہوئے آرچی بیلڈ گیلوے لکھتے ہیں کہ یہاں کے نظام قانون کا ایک بنیادی اصول ہے کہ ہر شخص پابند ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے جرم کے ارتکاب کو روکنے میں اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائے۔ گیلوے کے مطابق مسلمانوں کی حکومت میں یہی اصول رہا۔ سرکاری افسران کا بھی پورا نظام موجود تھا اور انھیں باقاعدہ تنخواہیں بھی دی جاتی تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ہر بستی کو محلوں اور وارڈ میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر محلے اور وارڈ کے سب سے زیادہ قابل احترام، یا پھر قابل شخص کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس شخص کو میر محلہ کہتے تھے۔ میر محلہ کے لیے لازم تھا کہ وہ محلے کے ہر شخص کو جانتا ہو، اس کے وسائل اور ذرائع آمدن سے باخبر ہو، اس کے طرز زندگی سے آگاہ ہو، حتیٰ کہ اس کی ذمہ داری تھی کہ محلے کے ہر قابل ذکر وقوعے کا اسے علم ہو۔ اس تفصیل کے بعد آرچی بیلڈ گیلوے اپنی حکومت سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ کیا ہم ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتے؟[16]

آرچی بیلڈ گیلوے کے خیال میں مغلوں کا یہ نظام جس میں مقامی سطح پر لوگوں کو با

[15] آرچی بیلڈ گیلوے، 432۔

[16] آرچی بیلڈ گیلوے، 443۔

اختیار کیا گیا تھا، برطانوی مجوزہ نظام سے بہتر تھا۔ چنانچہ وہ تجویز کرتے ہیں کہ تھانوں میں جب پولیس افسران تعینات کیے جائیں تو کوشش کی جائے کہ تھانے دار مقامی آدمی ہو اور اسی کمیونٹی کا ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ بے شک اس تصور پر تنقید ہو گی کیونکہ اس وقت عمومی سوچ یہی ہے کہ تھانے دار یا افسر مقامی ہو تو اس کے تعصبات اسے ٹھیک کام نہیں کرنے دیں گے لیکن وہ کہتے ہیں کہ مقامی تھانے دار کو جو مقامی معلومات ہوں گی ان کی اہمیت اس تنقید سے زیادہ ہے۔[17]

مغل پولیس کے ڈھانچے پر ہونے والی تنقید میں ایک بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مقامی لوگ ہی جب اختیارات کے مالک بنا دیے گئے تو انھوں نے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا۔ اس الزام میں ہو سکتا ہے صداقت ہو کہ یہ انسان کی فطرت ہے اسے جب اختیار ملتا ہے تو اپنے تعصبات کی تسکین میں انھیں بروئے کار لاتا ہے۔ لیکن کیا ایسے الزامات کی وجہ سے پرگنہ یا سرکار کا قاضی کوئی کارروائی نہیں کرتا تھا؟ نیز یہ کہ ایک عمومی سا الزام لگا کر ایک نظام کو رد کرنے سے پہلے ایسے شواہد سامنے لانا ضروری ہوتے ہیں جو ان الزامات کی تائید کر سکیں۔ ایسی کوئی دستاویز جس میں ایسے واقعات کو جمع کیا گیا ہو، کم از کم میری نظر سے ابھی تک نہیں گزری۔

البتہ میری نظر سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق چیئرمین کا یہ موقف ضرور گزرا ہے کہ برصغیر میں بہتر پولیس کے لیے ضروری ہے کہ اسی ڈھانچے کی خوبیوں کو باقی رکھا جائے جو مغل دور میں موجود تھیں۔

آرچی بیلڈ گیلوے کے خیال میں پولیس میں مقامی افسر بھرتی کرنا ایسی ہی ایک اچھی چیز ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسداد جرم کے لیے لازمی ہے کہ پولیس میں مقامی لوگ بھرتی کیے

[17] ایضاً، 428۔

جائیں۔ ان کے ذہن میں وہی مقامی کوتوال کا ماڈل تھا جو اپنے علاقے کے ہر آدمی، اس کی عمومی شہرت اور کردار سے واقف ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی علاقے میں کوئی بد معاش رہتا ہو اور اس علاقے میں اس کی شہرت بد معاش کی نہ ہو۔

پولیس کا افسر اگر باہر سے کسی دوسرے علاقے سے آیا ہو گا تو ہو سکتا ہے اس کے سامنے وہی بد معاش معززین شہر بن کر پیش ہوں لیکن افسر مقامی ہو تو مقامی بد معاش اس کے سامنے بد معاش ہی رہے گا، معزز نہیں بن سکے گا۔ وہ اس کے نقصانات کے احتمال کو تسلیم کرتے ہیں کہ مقامی افسر تعصبات کا شکار ہو سکتا ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ اگر قابل احترام شخص کا تعین کیا جائے تو اس کی افادیت اس خطرے سے زیادہ ہے۔ باہر کا افسر نہ مقامی حالات سے واقف ہوتا ہے نہ لوگوں کو جانتا ہے، نہ لوگوں سے رابطے میں ہوتا ہے، عوام سے کٹا ہوتا ہے، لوگوں کا اس پر اعتماد نہیں ہوتا لہذا اس کی افادیت کم ہوتی ہے۔ جب کہ مقامی افسر جو اسی کمیونٹی کا ہو، اگر قابل احترام شخص ہے تو اس کی افادیت بہت زیادہ ہو گی۔[18]

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل سلطنت سکڑتی گئی۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد تو گویا آخری رکاوٹ بھی دور ہوئی۔ اس دورانیے میں انگریزوں کا نظام دھیرے دھیرے پھیلتا گیا اور 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد پورے ہندوستان میں براہ راست برطانوی نو آبادیاتی نظام قائم کر لیا گیا۔ اس نئے بندوبست میں مقامی لوگوں کی شمولیت یا اس پولیس کے نظام کا پہلے کی طرح عوام دوست ہونا اور مؤثر ہونا مطلوب ہی نہیں تھا۔ مغلوں کے نظام کا مؤثر ہونا تو خود برطانوی

[18] الزبتھ کولسکی، *Colonial Justice in British India: White Violence and the Rule of Law* (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، 2010ء)، 231-232۔

پولیس کمیشن بھی تسلیم کر رہا تھا۔ معاملہ یہ تھا کہ اب مطلوب و مقصود ہی کچھ اور تھا۔

اب جو پولیس کھڑی کی جا رہی تھی اس کے ذریعے سامراجی تسلط کا تحفظ مقصود تھا۔ یہ نظام جن پر نافذ کیا جا رہا تھا وہ عوام یا شہری نہیں تھے کہ ان کے لیے سکاٹ لینڈ یارڈ والا ماڈل متعارف کرایا جاتا۔ وہ محکوم رعایا تھے جن پر آئرش کانسٹیبلری والا ماڈل مسلط کیا گیا۔ پولیس کیسی ہو، اس کا ڈھانچہ کیسا ہو، اس کا دائرہ اختیار کیا ہو اور اس کے اپنے احتساب کا کون سا طریقہ کار ہو ان سوالات پر غور کرنے والوں میں ایک بھی مسلمان نہ تھا، مسلمان تو کیا کوئی ایک مقامی شخص بھی اس قابل نہ سمجھا گیا کہ اس کی رائے لے لی جاتی۔ حاکموں نے بیٹھ کر فیصلہ کیا کہ محکوموں کے لیے کیسی پولیس چاہیے اور غاصبوں نے یہاں پولیس کا ایک نظام قائم کر دیا۔ جس وقت یہ نظام لاگو کیا جا رہا تھا اس وقت ہندوستان کا بادشاہ رنگون کے ایک گیراج میں قید پڑا تھا۔

برطانوی نو آبادیاتی نظام میں، 1857ء کی جنگ آزادی کو کچلنے اور بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے جلا وطن کرنے کے بعد، جو پولیس متعارف کرائی جا رہی تھی اس کے مقاصد مغل دور کی پولیس سے یکسر مختلف تھے۔ مغلوں کی پولیس اپنے شہریوں کے لیے تھی، یہ پولیس رعایا کے لیے تھی۔ وہ پولیس مقامی لوگوں پر مشتمل تھی، یہ پولیس غیر ملکی افسران پر مشتمل تھی۔ اُس پولیس کا بنیادی مقصد جرائم کی سرکوبی تھا، اِس پولیس کا بنیادی ہدف برطانوی سامراج کا تحفظ تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نو آبادیاتی پولیس اپنے ڈھانچے اور اپنے اختیارات، اپنے رویے کے اعتبار سے معاشرے کے لیے ایک نفسیاتی سانحے سے کم نہ تھی۔ یہ الزام نہیں ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف، بین السطور، خود برطانوی کمیشن نے 1902ء کی رپورٹ میں کیا ہے۔

صدیوں سے رائج کامیاب مغل انتظامی ڈھانچے کو تبدیل کر کے جو نو آبادیاتی پولیس کھڑی گئی، اس کے چند نمایاں اجزائے ترکیب یہ تھے:

1. یہ پولیس ایگزیکٹو کے ماتحت تھی۔ ایگزیکٹو کا کوئی سا بھی حکم ماننے کو تیار تھی۔ حکومت جو حکم دیتی، یہ اس پر غلط یا صحیح کی بحث میں پڑے بغیر عمل کو تیار تھی۔
2. یہ ایک اجنبی پولیس تھی۔ عوام اسے نہیں جانتے تھے، یہ عوام کو نہیں جانتی تھی۔
3. اس پولیس کا رویہ عوام دوست نہیں تھا، حاکم کا سا تھا۔ پولیس افسران عوام سے دور تھے اور باہم کوئی رابطہ نہ تھا۔
4. چوں کہ یہ پولیس 1857ء کی تحریک آزادی کو کچلنے کے بعد بنی تھی تو اس کی نفسیات اسی ماحول میں تشکیل پائی تھی۔ یہ نفسیات ایک ورثے کے طور پر اس کے ساتھ رہی۔
5. اس پولیس کا بنیادی مقصد جرائم کا خاتمہ نہیں تھا بلکہ گستاخوں اور بے ادبوں کی سرکوبی تھا تاکہ آئندہ یہاں کے لوگ 1857ء کی تحریک جیسی کسی جسارت کا سوچ بھی نہ سکیں۔
6. چوں کہ اس خاص ماحول میں یہ ایک آمرانہ طرز حکومت کے تحت بنایا گیا ادارہ تھا تو عوام اور اس کے تعلق میں اعتماد پیدا کرنے کی کوئی شعوری کوشش کی ہی نہیں گئی۔ بلکہ مقصد عوام میں اس کے بارے میں ایک خوف پیدا کرنا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے فلسطین میں آئرش کانسٹیبلری بھیجنے سے قبل وہاں ماحول بنایا گیا اور عرب مسلمانوں کو خوف زدہ کیا گیا کہ ہم ایسی فورس بھیج رہے ہیں جو تمہیں سیدھا کر دے گی۔ یہاں اس پولیس کا بنیادی وظیفہ بھی یہی تھا کہ لوگوں میں برطانوی راج کا خوف پیدا کیا جائے اور ایسا خوف پیدا کیا جائے کہ کوئی گستاخ اور بے ادب کسی گستاخی کا سوچے بھی نہیں اور اگر پھر بھی کوئی ایسی حرکت کرے تو اسے ایسے قوانین کی بھول بھلیوں میں ڈال دیا جائے کہ باقیوں کے لیے عبرت بنے۔
7. چوں کہ یہ پولیس محکوم رعایا کے لیے تھی شہریوں کے لیے نہیں تھی اس لیے اس کے احتساب کا کوئی بامعنی نظام وضع نہ کیا گیا۔ یہ عوام کو جواب دہ نہیں تھی۔ یہ صرف اور صرف

حاکم کو جواب دہ تھی۔ برطانیہ میں تو احتساب کا ایک باقاعدہ نظام موجود تھا۔ وہاں انڈی پنڈنٹ پولیس کمپلینٹس کمیشن تھا جو پولیس کے خلاف شکایات سنتا تھا (2018ء میں اس کی جگہ انڈی پنڈنٹ آفس فار پولیس کنڈکٹ نے لے لی) لیکن پولیس کا جو نظام برصغیر پر مسلط کیا گیا اس میں ایسے تکلف کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

اسی زمانے میں برطانیہ کے اپنے ہاں بھی پولیس کے نظام کے لیے قانون سازی ہو رہی تھی۔ لیکن نوآبادیات کی پولیس برطانیہ کی پولیس سے مختلف تھی۔ نوآبادیات کی پولیس کا تنظیمی ڈھانچہ نیم عسکری تھا۔ یعنی یہ پولیس نہیں ایک مسلح ملٹری فورس تھی۔ کہیں اس کا نام آئرش کانسٹیبلری تھا اور کہیں اس کا نام پولیس تھا۔ اس کا کام بس آرڈر کی تعمیل تھی۔ جو آرڈر آگیا، سر جھکا کر تعمیل کر دی۔ غیر معمولی اختیارات سے لیس اور احتساب کے خطرے سے بے نیاز ایک نیم فوجی قوت کھڑی کر دی گئی تاکہ رعایا کو خوف زدہ رکھا جا سکے اور وہ برطانوی سامراج کے لیے کسی قسم کی کوئی پریشانی پیدا نہ کر سکے۔

اب ایسے افسران آ گئے جن کے پاس بے پناہ طاقت تھی۔ قانون پیچیدہ تھا، اجنبی زبان میں تھا۔ لوگ اس سے ناواقف تھے لیکن مفروضہ یہ تھا کہ "Ignorance of law is no excuse" (قانون سے عدم واقفیت کوئی عذر نہیں ہے)۔ پولیس جیسے چاہے اس کو گھما سکتی تھی۔ احتساب کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ بنیادی وظیفہ حاکم کی خوشنودی تھی۔ جب تک حاکم چاہتا پولیس افسران عہدے پر موجود رہتے جب حاکم چاہتا انہیں ہٹا دیتا۔ ان کی مدت ملازمت کو کوئی تحفظ نہ تھا۔ آج ایک عہدے پر تو کل دوسرے عہدے پر۔ آج ایک شہر میں تو کل دوسرے شہر میں۔ چنانچہ اس پولیس کی نفسیاتی تشکیل ہی ان ہی خطوط پر ہوئی کہ عوام کو دبا کر رکھنا ہے اور حاکم کی ہر جائز ناجائز بات پر عمل کرنا ہے۔

الزبتھ کولسکی نے لکھا ہے کہ برطانیہ نے یہاں جو نظام قائم کیا اس میں برطانوی تسلط کی خاطر کیا جانے والا تشدد ایک معمول قرار پایا۔ ان کے خیال میں جبر اور تشدد یہاں کوئی استثنائی صورت حال نہیں تھی بلکہ یہ برصغیر میں برطانوی اقتدار کا ایک معمول تھا۔[19] الزبتھ کولسکی کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی مظالم کو ایک منطقی اور ناگزیر حربہ سمجھا جاتا تھا۔[20]

ڈیوڈ آرنلڈ نے سامراجی پولیس کے پیچھے سوچ کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھا کہ چوں کہ یہ پولیس ایک نوآبادیاتی ادارہ تھا جو برطانوی نوآبادیاتی بندوبست کو تحفظ دینے کے لیے بنایا گیا تھا اس لیے اہتمام کیا گیا کہ پولیس کبھی بھی مقامی لوگوں کو جواب دہ نہ ہو۔ چنانچہ یہاں حکومت کرنے کے لیے برطانوی مشینری کا انحصار پولیس پر تھا۔ جوں جوں برطانیہ کا اس پولیس پر انحصار بڑھتا گیا وہ پولیس کا عوامی محاسبے اور عوامی شکایات وغیرہ سے اتنا ہی زیادہ دفاع کرتے چلے گئے۔ عوام پولیس سے کٹ چکی تھی اور برطانوی بندوبست پولیس پر انحصار بڑھا چکا تھا۔ چنانچہ پولیس کے بارے میں عوام کی شکایات کو سننے والا ہی کوئی نہیں تھا۔[21]

اینیمل فارم جیسے شہرہ آفاق ناول کے مصنف جارج آرول ایک زمانے میں برصغیر میں پولیس افسر کے طور پر کام کرتے رہے۔ یہ 1922ء سے 1925ء تک کا دورانیہ ہے۔ اس زمانے میں برما ہندوستان کا ہی ایک صوبہ ہوتا تھا۔ وہ برما کے شہر ماؤلا میئن میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ

---

19 الزبتھ کولسکی، *Colonial Justice in British India*، 175۔

20 ڈیوڈ آرنلڈ، *Police Power and Colonial Rule* (آکسفورڈ: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس 1986ء)، 185۔

21 سر برنارڈ رولینڈ کریک، Blair, Eric Aurthur George Orwell (1903-1950)، مشمولہ: *Oxford Dictionary of National Biography*

سپرنٹنڈنٹ پولیس کے طور پر کام کرتے رہے۔ یہاں انھیں ڈینگی بخار ہوا اور وہ برطانیہ چلے گئے۔ صحت یاب ہونے پر انھوں نے واپس آنے کے بجائے اپنا استعفیٰ بھجوا دیا۔ برما میں بھی ایک مزاحمت چل رہی تھی جسے برطانیہ نے کچلا۔ شاید یہی وہ پس منظر تھا کہ آرول نے اس سارے تجربے کے لیے "Dirty work of Empire" (سامراج کے گندے کھیل) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ برما میں پولیس کی ملازمت کے دورانیے میں لوگوں کی بڑی اکثریت ان سے ہمیشہ نفرت کرتی تھی اور ایسی نفرت کا سامنا کرنا زندگی میں ان کا واحد تجربہ تھا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ جارج آرول نے بعد میں انقلاب روس پر تو اینمل فارم لکھ کر اس کے چیتھڑے اڑا دیے لیکن برما میں برطانوی سامراج کے بارے میں وہ ایسا کوئی شاہکار تخلیق نہ کر سکے۔ "A Hanging" کے نام سے انھوں نے ایک مضمون تو لکھا اور بلاشبہ بڑے موثر پیرائے میں لکھا کہ کیسے ایک قیدی کو پھانسی دی گئی۔ اس موقع پر اپنے احساسات کو انھوں نے بڑے درد کے ساتھ قلم بند کیا لیکن وہ یہ بات نہ بتا سکے کہ قیدی کون تھا اور برطانوی بندوبست اسے کس جرم میں پھانسی دے رہا تھا۔ سٹالن پر لکھنا شاید آسان ہو اور اپنے سامراج پر لکھنا اتنا آسان نہ ہو۔ چنانچہ آرول کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ لکھنے کو لکھ تو دیا لیکن بعد میں جب سوالات ہوئے تو کہہ دیا یہ تو صرف ایک کہانی تھی جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

مغل دور کا ڈھانچہ ادھیڑ کر رکھ دیا گیا اور اپنے سیاسی مقاصد کے لیے ایک نوآبادیاتی پولیس کھڑی کر دی گئی۔ 1857ء کے بعد کے عشروں میں سیاسی مقاصد تو پورے کر لیے گئے لیکن اس نوآبادیاتی پولیس کی کرپشن، اس کے مظالم، اس کی نااہلی اور اس کا سفاک طرز عمل ایک ایسا المیہ بن کر سامنے آئے کہ خود برطانوی سرکار کے لیے انھیں نظرانداز کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ ایک کمیشن بنا کہ وہ صورت حال کا جائزہ لے اور اصلاح احوال کے لیے تجاویز پیش کرے۔

اس کمیشن نے 1902ء میں اپنی رپورٹ کی ابتداء میں ہی وہ بات لکھی جو پیچھے نقل کی جاچکی ہے کہ مغل دور کا نظام برطانوی بادشاہ الفریڈ کے دور کے نظام سے ملتا جلتا تھا اور وہ اس ملک کے لیے فائدہ مند بھی تھا اور مناسب بھی تھا لیکن جس کی خامی یہ تھی کہ:

"It could not support the strain of political order and restoration of the control from above."

اب جب سیاسی مقاصد بھی پورے ہو گئے اور اوپر سے کنٹرول بھی قائم ہو گیا تو اب یہ کمیٹی حساب سود و زیاں کرنے بیٹھی کہ اس سارے عمل میں عوام پر کیا بیتی۔

اس کمیٹی کی رپورٹ خاصے کی چیز ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ برطانوی سامراجی پولیس ظالم ہے، بد عنوان ہے، سفاک ہے، نا اہل ہے، کام چور ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ رپورٹ نہیں، الزامات کا ایک پورا دفتر ہے۔ اس کا عنوان الگ ہے اور متن الگ ہے۔ یہ اس نو آبادیاتی پولیس پر مکمل عدم اعتماد ہے۔ اگرچہ عنوان تجاویز اور اصلاحات کا ہے لیکن متن میں یہ ایک مکمل فرد جرم ہے۔

اس کے شروع میں کہا گیا کہ جس مقامی مغل پولیس کے بندوبست کو ہم نے ختم کیا وہ تو اس نظام سے ملتا جلتا تھا جو ہمارے کنگ الفریڈ نے قائم کیا تھا۔ اس کے صفحہ بائیس (22) پر لکھا گیا کہ مقامی لوگوں کی شمولیت کو یقینی بنائیں کیونکہ یہ باہر کی پولیس جب کسی گاؤں میں جاتی ہے اور کسی شریف آدمی کی دہلیز پر دستک دیتی ہے تو پورے گاؤں میں خوف پھیل جاتا ہے اور اس سے ایک ناگوار تاثر پیدا ہوتا ہے۔ کمیٹی نے لکھا کہ اس نو آبادیاتی پولیس کا طرز عمل لوگوں کے ناقابل برداشت بوجھ بن چکا ہے۔ تجاہل عارفانہ دیکھیے کہ سکاٹ لینڈ یارڈ ماڈل کے بجائے آئرش

کانسٹیبلری کے ماڈل پر فورس تیار کر کے اب انسان دوستی پر مبنی تنقید کی جا رہی ہے کہ یہ پولیس تو لوگوں کے لیے ناقابل برداشت بوجھ بن چکی ہے۔

رپورٹ میں اسی صفحے پر لکھا کہ پولیس کا کام بھی ناقص ہے اور مجسٹریٹ کی عدالت بھی۔ کہا گیا کہ پولیس کی تفتیش لوگوں کے لیے مسائل پیدا کرتی ہے۔ وہ انھیں خوف زدہ کرتی ہے۔ اس سے گاؤں کی زندگی اور معمولات متاثر ہوتے ہیں۔

صفحہ بائیس (22) پر لکھا گیا کہ چوں کہ پولیس اور مجسٹریٹ دونوں کے کام میں نقائص ہیں؛ اس لیے لوگ اب جرائم کے معاملے میں غیر جانب دار اور لاتعلق ہو گئے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ پولیس کو اطلاع دی یا گواہی دی تو اس کے نتیجے میں ایک پیچیدہ قانونی عمل سے دوچار ہونا پڑے گا لہٰذا وہ کچھ بتاتے ہی نہیں۔ غور کیا جائے تو عوام کی یہ گرہ آج تک نہیں کھل سکی۔ لوگ آج بھی نیوٹرل ہی رہتے ہیں کیونکہ انھیں خوف ہے برطانوی نو آبادیاتی ڈھانچے پر استوار پولیس کو کچھ بتانا خود کو ایک ایسی دلدل میں اتار دینا ہے جو ان کا وقت، وسائل اور توانائی ہر چیز برباد کر سکتی ہے۔

پیرا گراف چھتیس (36) میں کہا گیا کہ وہی زمینداروں کی ذمہ داری والا پرانا نظام اگر کسی حد تک بحال کر دیا جائے تو معاملات بہتر ہو سکتے ہیں۔ انھیں پابند کیا جائے کہ وہ جرائم کی بابت پولیس کو اطلاع دیا کریں۔ (یہ وہی مغل بندوبست تھا جسے ناکارہ قرار دے کر ختم کیا گیا تھا)۔

پیرا گراف پچاس (50) میں کہا گیا کہ مغل دور کا وہی پرانا ولیج سسٹم بحال کیا جائے اور اسے پولیس کے ماتحت بھی نہ کیا جائے۔ (یہ وہی سسٹم تھا جسے اس لیے ختم کیا گیا کہ یہ control from above کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا تھا)۔

برطانوی نو آبادیاتی پولیس کے اس ڈھانچے کی کارکردگی کا سارا خلاصہ اس رپورٹ کے پیراگراف نمبر بارہ (12) میں بیان کر دیا گیا جس کا عنوان ہی "Failure of British

"Method" تھا۔ لکھا ہے کہ صورت حال بالکل بھی تسلی بخش نہیں ہے۔ ہر طرف جرائم میں اضافہ ہو گیا ہے۔ پہلے لوگ جرائم سے نبٹنے میں تعاون کرتے تھے اب نہیں کرتے۔ پولیس شواہد اکٹھے نہیں کر سکتی، عدالت ثبوت مانگتی ہے اور لوگ گواہی نہیں دیتے۔

پیراگراف بائیس (22) میں لگی لپٹی رکھے بغیر واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ برطانیہ کا متعارف کردہ پولیس کا نظام ناکام ہو گیا ہے اور اس کی بہت ساری وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ مقامی دیہاتی سطح پر تعاون نہیں مل رہا۔ ولیج پولیس تعاون نہیں کرتی۔ (اور جارج آرول جیسے افسران جو برطانیہ سے لا کر بٹھائے گئے انھیں مقامی حالات کا کچھ علم ہی نہیں)۔ یعنی یہ اسی بات پر مہر تصدیق ثبت کی جا رہی تھی جو انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق سربراہ آرچی بیلڈ گیلوے نے بہت پہلے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ پولیس میں جب تک افسران مقامی نہیں ہوں گے وہ کامیاب نہیں ہو گی۔

اس رپورٹ میں بھی مگر سفید فام بالادستی کا فکری بحران چھلک رہا ہے۔ چنانچہ جہاں یہ بات تسلیم کی گئی کہ برطانوی نظام پولیس تباہ کن ثابت ہوا اور ناکام ہو گیا وہیں یہ اہتمام بھی موجود ہے کہ غلطی کا ذمہ دار برطانوی فیصلہ سازوں کو نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ اس کی ذمہ داری مقامی لوگوں پر ڈال دی گئی۔ ناکامی کی وجوہات اب کچھ یوں بیان کی گئیں:

1. ولیج پولیس نے ریگولر پولیس سے تعاون نہیں کیا۔
2. مقامی لوگوں نے پولیس سے تعاون نہیں کیا۔
3. اہم ذمہ داریاں پولیس کے ان لوگوں کو دے دی گئیں جو نیچ طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ (یعنی مقامی لوگ تھے۔ اینمل فارم والے جارج آرول کی طرح

نہیں تھے)۔

پیراگراف بائیس (22) کے آخر میں البتہ انگریز افسران کے رویوں کو بھی ضمنی طور پر موضوع بنایا گیا اور یہ بعینہ وہی اعتراضات تھے جو آرچی بیلڈ گیلوے نے خدشات کے طور پر بہت پہلے پیش کر دیے تھے۔ کہا گیا کہ ان کی درست تربیت نہیں ہو سکی اور وہ اپنے ماتحتوں سے بھی رابطے میں نہیں تھے۔ حالانکہ یہ کلچر تو حکمت عملی کے تحت متعارف کرایا گیا تھا کہ صاحب لوگ مقامی آبادی اور مقامی لوگوں سے فاصلے پر رہیں گے۔

اس پوری رپورٹ میں ادھر ادھر کی بہت باتیں کی گئیں۔ لیکن جو لکھنے کی بات تھی وہ نہیں لکھی گئی کہ جو پولیس آئرش کانسٹیبلری سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہو وہ اس سے مختلف نتائج دے ہی نہیں سکتی۔ اس کے بجائے سارا نزلہ مقامی لوگوں پر گرا دیا گیا۔

پیراگراف چوبیس (24) میں کہا گیا کہ ہر کوئی پولیس کی کرپشن کی شکایات کر رہا ہے اور ساتھ ہی وجہ بھی بیان کر دی کہ چوں کہ کانسٹیبل معاشرے کے نچلے طبقات سے لیے گئے اس لیے وہ چپڑاسیوں کی طرح بے ایمان اور کرپٹ ثابت ہوئے اور ان میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو نیچ اور نچلے طبقات میں ہوتی ہیں۔

کانسٹیبل کے لیے نیچ اور نچلے طبقات کی اصطلاح ستعمال کرنے والے کمیشن کا رویہ بد اخلاقی پر مبنی تھا اور انسانی قدروں سے فروتر اور واقعاتی طور پر بھی غلط تھا، اس کا حاصل مطالعہ واقعاتی طور پر بھی غلط تھا کیونکہ ادارے کی کرپشن کا ذمہ دار صرف کانسٹیبل کو ٹھہرا دینا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ یہی کلچر آج بھی رائج ہے کہ پولیس میں خود احتسابی کے نام پر بس دو چار نچلی سطح کے اہلکاروں کے خلاف کارروائی کر دی جائے اور سمجھا جائے ہم سرخرو گئے ہیں۔

اسی پیرا گراف میں بتایا گیا کہ پولیس کا رویہ غیر انسانی اور ظالمانہ ہے۔ لوگ پولیس سے بے زار ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے اس پولیس سے جتنا ممکن ہو دور رہا جائے۔ یہ پولیس شرفا اور معززین کی تذلیل کرتی ہے اور انھیں جھوٹے الزامات میں گرفتار کر لیتی ہے۔ (غور کیجیے آج کل کیا صورت حال ہے)۔

پیرا گراف پچیس (25) میں برطانوی نو آبادیاتی پولیس کے بارے میں لکھا گیا کہ اتنی کرپٹ اور بد عنوان ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی شکایات لے کر اس کے پاس آئے تو ''فیس'' وصول کیے بغیر یہ شکایت تک درج نہیں کرتی۔ لکھا گیا کہ پولیس کے ہر کام میں کرپشن ہے۔ وہ کوئی بھی کام 'فیس' یا 'تحفے' کے بغیر نہیں کرتی۔ درخواست کی طرف توجہ دلانے کے لیے لوگوں کو انھیں 'فیس' دینا پڑتی ہے۔ تفتیش کے تمام مراحل میں پولیس صرف پیسے بٹورتی رہتی ہے۔ جب پولیس اہلکار تفتیش کے لیے جائے وقوعہ پر جاتے ہیں تو شکایت کنندہ کا معاشی نقصان کر آتے ہیں، ان کے اخراجات گواہوں اور بعض اوقات سارے گاؤں کو برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ یہ لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے ہیں، یہ ان کے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ یہ لوگوں کو دھمکی دے کر مرضی کی گواہیاں لیتے ہیں کہ ہماری مرضی پر نہیں چلو گے تو تمہاری عورتوں کو خمیازہ بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ پولیس کا تھانے دار اتنا کرپٹ ہو چکا ہے کہ غیر جانب دار رہنے کے لیے بھی فریقین کو رشوت دینا پڑتی ہے کہ وہ کسی کی طرف داری کیے بغیر تفتیش کرے۔

پیرا گراف پچیس (25) میں بتایا گیا کہ برطانوی نو آبادیاتی پولیس جب کسی بستی یا گاؤں میں تفتیش کرنے جاتی ہے تو بعض اوقات اس کا قیام وہاں طویل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کئی کئی دن وہاں قیام پزیر ہو کر 'مہمان نوازی' کرواتی رہتی ہے۔ مقامی آبادی کو بعض اوقات سارا سارا دن ان کے حضور پیش رہنا پڑتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سارے کا سارا گاؤں ہی طلب فرما لیا جاتا

ہے۔ مشکوک لوگوں کو اور ان کے ساتھ بے گناہ اور معصوم لوگوں کو دھمکایا جاتا ہے اور ان کی توہین اور تذلیل کی جاتی ہے۔ انھیں ڈرا دھمکا کر مرضی کے بیانات لیے جاتے ہیں۔ پولیس مشکوک لوگوں کو اٹھا لیتی ہے اور ان کی گرفتاری ظاہر کیے بغیر انھیں تحویل میں لیے رکھتی ہے۔ پولیس کا کسی مقدمے میں جو اپنا موقف ہوتا ہے یہ سب کچھ اسی موقف کی تائید میں بیانات لینے کے لیے کیا جاتا ہے۔ پولیس کو اگر اپنی کسی مقدمے کو اپنی مرضی کا رخ دینے کے لیے شواہد نہ ملیں تو وہ جعلی اور جھوٹی شہادتیں بھی تیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بے گناہ لوگ اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ شکایات بھی عام ہیں کہ کسی مقدمے میں مناسب تفتیش نہ ہو سکے تو پولیس مدعی ہی کو ڈرا دھمکا کر یہ بیان دلوا لیتی ہے کہ مقدمہ ہی جھوٹا تھا۔ چنانچہ کمیشن سوال کرتا ہے کہ ان حالات میں اگر لوگ پولیس کی تفتیش کے عمل کا حصہ بننے سے گریز کی راہ اختیار نہ کریں تو وہ اور کیا کریں؟

پیرا گراف چھبیس (26) میں ہی کمیشن لکھتا ہے کہ پولیس مجرمان سے اپنے فائدے کے لیے تعلقات بنا کر رکھتی ہے۔ پولیس بے گناہوں کو تنگ کرتی ہے۔ وہ کسی کو بھی شک کی بنیاد پر اٹھا لیتی ہے۔ اٹھا کر تشدد کرتی ہے۔ بے گناہوں کو جھوٹے مقدموں میں پھنساتی ہے۔

پیرا گراف تیس (30) تو خاصے کی چیز ہے۔ کمیشن لکھتا ہے کہ پولیس انتظامیہ میں کچھ بڑے نقائص بھی موجود ہیں لیکن کمیشن ان کا یہاں ذکر نہیں کرے گا۔ یہاں گویا کمیشن صرف مقامی کانسٹیبلوں کے خاندانی پس منظر کا تمسخر اڑانے تک محدود رہا اور برطانوی افسران کے بارے میں کوئی بات کرنا اس نے یہاں مناسب نہیں سمجھا۔ بار بار مقامی اہلکاروں کو نیچ ذات اور نچلی ذات کے پس منظر کا طعنہ دیا گیا لیکن جارج آرول صاحب جیسے غیر ملکی اعلیٰ افسران کی کارکردگی کے بارے میں کمیشن ایسے خاموش رہا جیسے حد ادب کے تقاضے نبھا رہا ہو۔

پیراگراف اکتیس (31) میں کمیشن نے ہاتھ کھڑے کر دیے اور صاف لکھ دیا کہ معاملات کو چلانا برطانیہ کی (نوآبادیاتی) پولیس کے بس کی بات ہی نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے ولیج پولیس کی معاونت حاصل ہو (یعنی اب پھر اسی مغل دور کے بندوبست کی اہمیت کا احساس ہونے لگا)۔ چنانچہ کمیشن نے لکھا کہ گاؤں کے لوگوں سے کہا جائے کہ اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل خود ہی حل کر لیا کریں اس پولیس کے پاس نہ آیا کریں۔ اور اگر کوئی بڑا جرم ہو جائے تو اس برطانوی پولیس کو اس کی اطلاع ضرور دے دیا کریں۔

پیراگراف پچاس (50) میں کمیشن نے تجویز دی کہ ولیج سسٹم، یعنی گاؤں کے اسی پرانے نظام کو مستحکم کیا جائے۔ اس سے پچھلے پیراگرافس میں کمیشن نے پنجاب کے گاؤں کے لمبرداروں کی افادیت کے تحت اس نظام کو بھی جاری رکھنے کی تجویز دی۔

یاد رہے کہ یہ کمیشن خود برطانیہ نے بنایا تھا اور اس کے صدر سر اینڈریو ایچ ایل فریزر تھے جو مغربی بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر رہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس خطے پر تحقیق کے لیے بنائی گئی ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر کے منصب پر بھی فائز رہے۔ اس کے ممبران میں مسٹر جسٹس کینڈی، مہاراجہ آف دربھانگہ، دیوان بہادر ایس سری نیواسا، لیفٹیننٹ کرنل جے اے ایل منٹگمری، ڈبلیو ایم کول ون، اے سی ہنکن شامل تھے اور اس کے سیکرٹری ایچ اے سٹیورٹ تھے۔

برطانوی نوآبادیاتی بندوبست کے قائم کردہ اس کمیشن کی یہ رپورٹ 1902ء میں پیش کی گئی جو اپنے متن کے اعتبار سے اس نظام پر عائد ایک فرد جرم سے کم نہیں۔ 1902ء کی اس رپورٹ کے مندرجات اگر آج بھی شائع کر دیے جائیں تو ایک لمحے کو محسوس نہیں ہوگا کہ یہ ایک

سو بیس سال پرانی پولیس کی بات ہو رہی ہے یا آج کی پولیس کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ ان بارہ عشروں میں پولیس کلچر میں کیا تبدیلی آئی ہے؟ دکھاوے کی رفوگری اور عہدوں کے نام بدل دینے سے کلچر بدلتا ہے نہ سسٹم۔ پولیس آج بھی اسی ڈھانچے پر کھڑی ہے جو پولیس ایکٹ، 1861ء میں وضع کیا گیا تھا۔ چنانچہ مسائل بھی وہی ہیں، رویے بھی وہی ہیں اور شکایات بھی وہی ہیں۔ پولیس کے سولہ عشروں کا یہ سفر دائروں کا سفر بن کر رہ گیا ہے۔

پولیس سے ہر ایک کو شکوے ہیں لیکن خرابی کی بنیاد پر بات کم ہی ہوتی ہے۔ خرابی یہ ہے کہ اس پولیس کے نظام کا ڈھانچہ ہی عوام دوست نہیں ہے۔ یہ آئرش کانسٹیبلری کی طرز پر کھڑی کی گئی ایک ایسے فورس ہے جس کا مقصد عوام کو خوف زدہ رکھ کر سلطنت برطانیہ کے تسلط کو قوت بخشنا تھا۔ یہ پولیس شہریوں کے نہیں تھی، یہ رعایا کے لیے تھی۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام ختم ہوا تو یہاں کی مقامی بالادست قوتوں نے اسی نظام کی باقیات کو ان ہی خطوط پر قائم رکھا چنانچہ ایک عام آدمی کی زندگی آج بھی رعیت اور غلام جیسی ہے، برابر کے شہری جیسی نہیں ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ آئرش کانسٹیبلری کے اس ڈھانچے سے نجات حاصل کی جائے۔ پولیس کے ایک ایسے بندوبست کی ضرورت ہے جو رعایا کے لیے نہ ہو، اپنے شہریوں کے لیے ہو۔ جس کا رویہ آمرانہ نہ ہو، دوستانہ ہو۔ جو خود کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا یا سلطنت برطانیہ کا 'صاحب لوگ' نہ سمجھے بلکہ وہ خود کو عوام کا اور عوام کو اپنا حصہ سمجھے۔ جو صاحبان اقتدار کی آلہ کار نہ ہو، عوام کی دوست ہو۔ جو محاسبے سے بالاتر نہ ہو بلکہ عوامی شکایات پر بامعنی احتساب کے نظام کے تحت بروئے کار آتی ہو۔ جسے دیکھ کر ایک عام آدمی خوف محسوس نہ کرے بلکہ اسے تحفظ کا احساس ہو۔

پاکستان کو ملکہ وکٹوریہ کی نہیں، اپنی پولیس کی ضرورت ہے۔ پاکستان کو چارلس جیمز نیپیئر کے تصورات پر مبنی پولیس نہیں چاہیے، پاکستان کو بیرسٹر محمد علی جناح، قائداعظم کے ویژن پر استوار پولیس درکار ہے۔

باب پنجم

نوآبادیاتی قانون: غلامی کی 'مدون' دستاویز

پولیس کی طرح ہمارا فوجداری قانون بھی دور غلامی کا ہے۔ اس کی معتبر اور بنیادی دستاویز مجموعہ تعزیرات پاکستان ہے۔ یہ قانون 1860ء کا ہے جو برطانیہ نے 1857ء میں جنگ آزادی کو کچلنے کے بعد ہندوستان میں نافذ کیا۔ دور غلامی کی یہ مدون دستاویز تعزیرات پاکستان کہلاتی ہے۔

فوجداری قانون کی دوسری معتبر دستاویز کا نام مجموعہ ضابطہ فوجداری (Code of Criminal Procedure) ہے برطانیہ نے 1898ء میں برصغیر میں نافذ کیا۔ 1898ء کا یہ قانون اس وقت پاکستان کا ضابطہ فوجداری ہے اور فوجداری مقدمات کے مراحل اسی کی روشنی میں طے ہوتے ہیں۔

تعزیرات پاکستان نامی یہ قانون پاکستان کے قیام سے 87 سال پہلے کا ہے اور پاکستان کا مجموعہ ضابطہ فوجداری اس کے قیام سے 49 پہلے کا ہے۔

یہ معاملہ صرف ان دو قوانین تک محدود نہیں۔ دیوانی قوانین کا بھی یہی حال ہے۔ مجموعہ ضابطہ دیوانی (Code of Civil Procedure) قیام پاکستان سے 39 سال پہلے 1908ء میں نافذ ہوا اور آج پاکستان میں تمام دیوانی مقدمات اسی ضابطے کے تحت چلائے جاتے ہیں۔

لینڈ ایکوی زیشن ایکٹ، جس کے تحت کسی بھی شخص کی زمین اس سے لے لی جاتی ہے اور اس پر بالادست طبقات کے لیے ہاؤسنگ کالونی تک بنالی جاتی ہے، 1894ء کا ہے۔ یہ قانون 1857ء کی جنگ آزادی کو کچلنے کے 19 سال بعد فاتح قوت نے محکوم ملک میں نافذ کیا۔ یہ قانون آج بھی پاکستان میں نافذ العمل ہے اور پہلے سے زیادہ سنگین نوعیت کے ساتھ نافذ ہے۔

کنٹریکٹ ایکٹ (Contract Act) برصغیر میں 1872ء میں نافذ ہوا۔ یعنی قیام پاکستان سے 75 سال پہلے۔ یہ آج بھی پاکستان کا قانون ہے۔

یہ ایک طویل فہرست ہے، جس کا مکمل تعارف طوالت کا باعث بنے گا۔ جو بنیادی بات سمجھنے کی ہے اس کے لیے یہ اجمالی سا جائزہ کافی رہے گا۔ اصل اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ پاکستان کی پارلیمان نے پاکستان کے لیے کامل اپنے قوانین کیوں نہیں بنائے اور ہم آج تک دور غلامی کے ان قوانین سے اپنے معاملات زندگی کیوں چلا رہے ہیں؟

نوآبادیاتی دور کے یہ تمام قوانین یقیناً مجموعہ نقائص نہیں ہیں۔ ان میں خوبیاں بھی ہوں گی اور خامیاں بھی۔ لیکن ان کا جو بنیادی نقص ہے وہ یہ ہے کہ یہ قوانین ہم نے نہیں بنائے۔ یہ ہم پر مسلط کیے گئے۔ مسلط کرنے والے فاتحین تھے۔ انھوں نے مقامی لوگوں سے رائے نہیں لی۔ ان قوانین کا بنیادی ڈھانچہ عوام دوست نہیں، سامراجی ہے۔ ان کا مقصد انصاف کی فراہمی نہیں لوگوں کو طاقت اور جبر کے ذریعے محکوم بنا کر رکھنا ہے۔ کیا یہ ایک آزاد ملک کے شایان شان ہے کہ اس کے قوانین وہ ہوں جو کسی اور قوم نے کہیں اور بیٹھ کر اس کے دور غلامی میں اس پر مسلط کر دیے ہوں؟ کیا یہ بات شرف انسانی سے کم تر درجے کی نہیں ہے کہ ایک آزاد اور خود مختار ملک، دور غلامی کے قوانین سے اپنے معاملات نبٹا رہا ہو اور وہ اپنے لیے 'اپنی تہذیب و اقدار اور روایات سے ہم آہنگ قانونی ڈھانچہ بھی نہ بنا سکے؟

ان میں سے کچھ قوانین فرسودہ ہو چکے ہیں، کچھ ہماری اقدار کے خلاف ہیں اور کچھ ہمارے آئین سے متصادم ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو ہمیں نوآبادیاتی دور کی یاد دلاتے ہیں کہ ہم دوسرے یا تیسرے درجے کے شہری ہیں۔ کچھ قوانین وہ ہیں جن کی وجہ سے ہمارے شہری آج بھی اس شرف اور وقار سے محروم ہیں جو ایک آزاد قوم کے باشندوں کا وصف ہوتا ہے۔ گویا یہ المیہ سادہ نہیں، یہ بہت پیچیدہ اور ہمہ جہت ہے۔ یہ صرف قانون و انصاف کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ انسان کے نفسیاتی اور روحانی وجود سے بھی متعلق ہے۔ اس سے پیدا ہونے والی قباحتیں بھی صرف قانونی نہیں، ان کا دائرہ کار بھی سماج اور اس کی ثقافت اور فکر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سے احساس کمتری، مرعوبیت اور خود شکستگی جیسے مسائل جنم لیتے ہیں۔

ایک آزاد اور خود مختار قوم کا یہ حق ہوتا ہے کہ اس کے اپنے قوانین ہوں جو اس کی مذہبی اور سماجی اقدار سے ہم آہنگ ہوں اور جنھیں اس قوم کے اپنے منتخب نمائندوں نے اپنی پارلیمان میں اپنی دانش اجتماعی کو بروئے کار لا کر بنایا ہو۔ لیکن اگر آپ کا فوجداری قانون بھی قیام پاکستان سے پون صدی پہلے کا ہو اور دیوانی قانون بھی قیام پاکستان سے چار عشرے پہلے کا ہو تو پھر پارلیمان کی فعالیت ہی نہیں، اس کی افادیت پر بھی سوال اٹھتا ہے۔

اس بحث کو کسی جذباتی کیفیت میں نہیں، بلکہ سیاق و سباق میں پوری معنویت کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ قیام پاکستان کے وقت ہمیں تین بنیادی باتوں کو طے کرنا تھا۔

پہلی بات تھی یہ کہ ہمارا آئین کیا ہو گا۔ پاکستان تو بن گیا تھا لیکن آئین نہیں تھا۔ ابھی دستور ساز اسمبلی نے بیٹھنا اور پاکستان کا آئین بنانا تھا۔ خلا میں معاملات نہیں نبٹائے جا سکتے تھے۔ چنانچہ طے کر دیا گیا کہ جب تک ہم اپنا آئین نہیں بنا لیتے، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935ء ہمارا عبوری آئین ہو گا۔ یہی بات انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947ء میں بھی کہی گئی تھی۔

جب تک ہم اپنا آئین نہ بنا لیتے، ہم انڈی پنڈنٹ ڈومینین رہتے، جارج ششم ہمارے آئینی سربراہ ہوتے اور گورنر جنرل ان کے نمائندے کے طور پر کام کرتے۔ چنانچہ 1952ء تک جارج ششم ہمارے آئینی سربراہ رہے اور ان کی وفات سے لے کر 23 مارچ 1956ء تک ملکہ برطانیہ (الزبتھ) ہماری آئینی سربراہ رہیں۔ ہم نے مارچ 1956ء میں اپنا آئین بنا لیا تو برطانوی بادشاہت بھی ختم ہو گئی اور گورنر جنرل کا عہدہ بھی ختم ہو گیا۔

یہ ایک منطقی اور معقول بندوبست تھا۔ پاکستان جنگ کر کے نہیں بلکہ سیاسی جدوجہد کے ذریعے حاصل کیا گیا۔ ایک آئینی اہتمام سے برطانیہ یہاں سے نکلا تھا اور یہاں دو ریاستیں وجود میں آئی تھیں۔ اسی آئینی رسم کے طور پر جارج ششم پاکستان کے پہلے آئینی سربراہ قرار پائے اور ان کے بعد ملکہ الزبتھ۔ لیکن عملاً پاکستان کی دستور ساز اسمبلی بااختیار تھی۔ یہاں تک کہ گورنر جنرل آئینی طور پر بے شک برطانوی بادشاہ کا نمائندہ تھا لیکن اس کا انتخاب پاکستان کی اسمبلی خود کرتی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بھارت نے تو ماؤنٹ بیٹن ہی کو اپنا گورنر جنرل بنا لیا لیکن پاکستان نے ماؤنٹ بیٹن کو اپنا گورنر جنرل تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے قائد اعظم کو اپنا گورنر جنرل بنایا۔

پاکستان کے اپنے آئین کے بننے تک، آئینی تقاضے کے طور برطانوی بادشاہ اور پھر ملکہ ہی بطور سربراہ ریاست موجود رہے، سفیروں کی تقرری بھی ان ہی کے دستخطوں سے ہوتی رہی لیکن یہ ایک رسمی بندوبست تھا۔ پاکستان کے معاملات چلانے کے لیے پاکستان کی اسمبلی بااختیار تھی۔ یہ رسمی بندوبست بھی اس وقت تک تھا جب تک پاکستان اپنا آئین نہ بنا لیتا۔ ایسا ہی بندوبست بھارت میں بھی تھا۔ یہی بات جسٹس کارنیلیس نے بعد میں اپنے فیصلے میں بھی لکھی کہ پاکستان ڈومینین کے اندر ایک آزاد اور مکمل خود مختار ملک ہے۔ یہ فیصلہ انھوں نے اس وقت لکھا جب

ابھی پاکستان نے اپنا آئین نہیں بنایا تھا اور عبوری آئین کے تحت ملکہ الزبتھ پاکستان کی آئینی سربراہ تھیں۔

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے جب 'قراردادِ مقاصد' منظور کرتے ہوئے اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کا اعلان کیا اور قرار دیا کہ یہ اختیارات اللہ کی امانت ہیں اور ملک کو قرآن و سنت کے مطابق چلایا جائے گا تو اس وقت بھی چوں کہ ہمارا آئین نہیں بنا تھا اور جارج ششم ہی ہمارے آئینی سربراہ تھے لیکن پاکستان کی اسمبلی اپنے شعوری سفر کی طرف بڑھ چکی تھی کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو گا۔

اس سے پہلے قائد اعظم بھی دستور ساز اسمبلی کو پاکستان کا آئین تیار کرنے کی ہدایت کر چکے تھے اور واضح طور پر کہہ چکے تھے کہ یہ ملک اسلامی اصولوں کے مطابق چلے گا۔ سٹیٹ بنک کو انھوں نے ہدایت کر دی تھی کہ اسلامی اصولوں پر معیشت استوار کرنے کا منصوبہ بنا کر پیش کیا جائے۔ قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اس وقت بھی آئینی سربراہ تو جارج ششم تھے لیکن پاکستان بطور اسلامی ریاست اپنے خدوخال قائد اعظم کی رہنمائی میں وضع کر رہا تھا۔

ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ پاکستان نے اپنی فکری سمت کا تعین کرنے کے بعد بادشاہ سلامت کو کوئی عرضی بھیجی ہو کہ اسلام کے اصولوں کے تحت معاملات چلانے کی اجازت دی جائے اور برطانوی بادشاہ نے جو چرچ آف انگلینڈ کے سربراہ بھی ہوتے تھے، ازراہ مروت اور ازراہ لطف و کرم اس کی اجازت عطا فرما دی ہو۔

عبوری آئین کی رسمی محدودیت کے باوجود یہ خود مختار فیصلہ سازی عملیت پسندی اور مثالیت پسندی کے درمیان ایک خوبصورت توازن تھا کہ ہمارے پاس فی الوقت آئین نہیں ہے تو ہم عارضی طور پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935ء کے تحت ہی معاملات چلاتے ہیں لیکن ہم

ایک خود مختار ملک کے طور پر اپنی مذہبی اور تہذیبی شناخت کے ساتھ بروئے کار آتے ہوئے اپنی سمت کا تعین بھی کریں گے اور اپنا آئین بھی بنائیں گے۔

قائد اعظم بہت جلد خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ کچھ اور وقت زندہ رہتے تو پاکستان کی آئینی اور قانونی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ ان کے بعد سیاست کی دنیا میں ان کا کوئی جانشیں نہ تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے فکر کی دنیا میں ہمارے پاس اقبال کا کوئی جانشیں نہ تھا۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ قانون کون سا ہو گا؟ 14 اگست 1947ء کو ایک پی سی او (عبوری آئینی حکم نامہ) جاری کیا گیا اور یہ اصول طے کر دیا گیا کہ برطانوی دور کے تمام قوانین ہمارے قوانین ہوں گے اور جب تک کسی قانون میں تبدیلی نہیں کی جاتی، یا اسے منسوخ نہیں کیا جاتا، یہی قانون رائج رہے گا۔ یہ بندوبست بھی عارضی تھا۔ قاعدہ وہی تھا جو آئین کے باب میں تھا کہ جب تک اپنا آئین نہیں بنتا ہم گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935ء ہی کو عبوری آئین کے طور پر اختیار کریں گے۔ یہاں بھی وہی قاعدہ بروئے کار آیا کہ جب تک ہماری پارلیمان ہمارے لیے اپنے قوانین نہیں بنا لیتی تب تک ہم ان ہی قوانین کے ذریعے معاملات چلاتے رہیں گے۔ یہ بھی ایک منطقی سی بات تھی کیونکہ نظامِ ریاست چلانے کے لیے عارضی طور پر کوئی قاعدہ قانون تو چاہیے تھا۔

معاملہ یہ ہوا کہ کافی تاخیر سے ہی سہی، آئین تو ہم نے بنا لیا لیکن پھر یہاں اقتدار کی ایسی داخلی کشمکش شروع ہو گئی کہ پارلیمان کے اپنے وجود کو ہی خطرات لاحق ہو گئے۔ ہم اپنے قوانین نہ بنا سکے۔ چنانچہ 1956ء میں جب ہم نے پہلا آئین بنایا تو ایک بار یہی اصول اس میں بھی لکھ دیا کہ برطانوی دور کے تمام قوانین ہمارے قوانین ہوں گے، تاوقتیکہ ان میں تبدیلی نہ کر دی جائے یا انھیں منسوخ نہ کر دیا جائے۔

یہی بات ہم نے 1962ء کے آئین میں بھی لکھ دی۔ 1973ء کا آئین آیا تو وہاں بھی آرٹیکل 268 کی ذیلی دفعہ ایک میں یہی اصول طے کر دیا گیا۔ گویا یہاں بھی آئین سازوں کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ برطانوی قوانین کو ہم عارضی طور پر اپنا قانون قرار دے رہے ہیں اور جلد یا بدیر ان کو ختم کر کے اپنے قوانین رائج کرنے ہیں۔ یہی بات بھارت نے بھی اپنے آئین کے آرٹیکل 272 میں طے کر دی کہ تمام نوآبادیاتی قوانین اسی طرح رائج رہیں گے جب تک انھیں ختم نہیں کیا جاتا۔

یہ سفر مگر وہیں برفاب سا ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم نے اسلامائزیشن اور اصلاحات کے عنوانات سے کچھ رفوگری تو کی ہے لیکن ہم بنیادی قانونی ڈھانچہ نہیں بدل سکے اور معاشرہ آج بھی دورِ غلامی کے قانونی بندوبست کی لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہے۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ عمال حکومت یعنی ملازمین کہاں سے آئیں گے؟ انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947ء نے طے کر دیا اور ہم نے مان لیا کہ وہ تمام ججز اور بیوروکریٹ جو قیام پاکستان کے وقت برطانیہ کی سرکار کے لیے خدمات انجام دے رہے تھے، اب نئی ریاستوں میں ان ہی شرائط و ضوابط پر چلے جائیں گے اور انھیں وہ تمام مراعات دستیاب رہیں گی جو برطانوی نوآبادیاتی نظام میں انھیں میسر تھیں۔ ملک چلانے کے لیے ایک بیوروکریسی کی ضرورت تو تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ بعد میں اس بیوروکریسی کا مزاج نہ بدلا جا سکا۔

ان افسران نے یہاں 'سول سرونٹ' کے طور پر نہیں بلکہ ایک آقا کی حیثیت سے رعایا پر حکومت کی تھی۔ ان کے طور طریقے بھی وہی تھے اور ان کی تربیت ان ہی خطوط پر ہوئی تھی کہ آپ اس رعایا کے حاکم ہیں۔ شہری کا تو کوئی تصور نہیں تھا۔ چنانچہ اس سول سروس کے ساتھ حاکم کی نفسیات کا پورا ایک کلچر ہمارے حصے میں آ گیا۔ ان لوگوں کی نفسیاتی گرہ نہ کھل سکی کہ اب وہ

کمپنی بہادر یا سلطنت عظمیٰ کی طرف سے محکوم رعایا پر مسلط کیے گئے آقا نہیں بلکہ ایک قومی ریاست کے 'پبلک سرونٹ' ہیں۔ یہی بیوروکریٹ قیام پاکستان کے بعد اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں میں بھی پہنچ گئے اور انھوں نے ہر چیز کو بازیچہ اطفال بنا دیا۔ اس بیوروکریسی نے نوآبادیاتی دور غلامی کی برطانوی افسر شاہی کے جس طرز زندگی اور مزاج کا مشاہدہ کیا تھا یہ اسی کو وراثت سمجھ کر گلے لگا بیٹھے اور ملک میں انھیں کوئی روکنے والا نہیں تھا۔

ان کی رہائش، ان کی مراعات، ان کے اللے تللے، ان کے ناز نخرے آج بھی وہی ہیں جو اس دور میں تھے۔ یہ اسی روایت کے نگہبان ہیں جو رعایا پر مسلط کی گئی تھی۔ پولیس، اسسٹنٹ کمشنر، ڈپٹی کمشنر وغیرہ کا منصب جو 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد خاص مقصد کے لیے تخلیق کیا گیا تھا، آج بھی اسی رعونت اور مراعات کے ساتھ موجود ہے۔ وہی پولیس ہے، وہی قوانین ہیں اور وہی بے بس رعایا ہے۔ کبھی لگان کے ذریعے اس کی کمر دہری کی جاتی تھی تو کبھی 'فیول پرائس ایڈ جسٹمنٹ' کے نام پر۔ افسر شاہی کی مراعات مگر اس وقت بھی کم نہیں کی جاتیں جب ملک دیوالیہ ہونے کے خطرے سے دوچار ہو۔ مطلوب و مقصود وہی ہے کہ اشرافیہ اور افسر شاہی مزے میں رہیں اور سارا بوجھ عوام پر منتقل کر دیا جائے۔

برطانیہ ایک غاصب قوت تھی اور برصغیر محکوم۔ چنانچہ افسر شاہی اور قوانین ایک خاص سوچ کے ساتھ بنائے گئے، ہم نے دونوں کو گود لے لیا اور نہ افسر شاہی کا ڈھانچہ بدلا نہ قانون۔ چنانچہ آج ہمیں یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ کمشنر سرگودھا 104 کنال کے گھر میں رہتا ہے۔ امریکی صدر کے وائٹ ہاؤس سے تھوڑے سے چھوٹے محل میں۔ یہی نہیں بلکہ اس 'پبلک سرونٹ' کے محل کے باہر 'رعایا' کے لیے حکم آویزاں ہے کہ یہاں آس پاس، صاحب کے گھر کی دیوار کے ساتھ، سڑک کنارے، کہیں بھی گاڑی روکنا منع ہے۔ خلاف ورزی پر حوالہ پولیس

کیا جائے گا۔ آدمی سوچتا ہے وہ کہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے 'صاحب لوگ' کے دور میں تو نہیں چلا گیا۔ اس بیوروکریسی کا ایک خاص مزاج ہے۔ یہ اپنے فرسودہ قوانین کے ساتھ ابھی تک برطانوی دور میں رہ رہی ہے اور عوام کو رعایا سمجھتی ہے۔ اس کے اخراجات، اس کی تنخواہیں، اس کا رویہ، اس کی مراعات، سب کچھ وہی دور غلامی کی افسر شاہی جیسا ہے۔ یہ گویا آج بھی محکوم رعایا پر حکم چلانے کے لیے فاتحین کی صورت موجود ہیں۔

برطانیہ نے خود تو ہندوستان سے جانے والے افسران سے مختلف طریقوں سے نجات حاصل کر لی کہ یہ ہندوستان سے آئے ہیں، ان کی نفسیات آقا والی بن چکی ہے جب کہ یہاں برطانیہ میں ہمیں 'پبلک سرونٹ' چاہییں، آقا نہیں چاہییں۔ لیکن ہم پاکستان میں ایسا کچھ نہ کر سکے۔ وہی انگریزی دور والا رویہ، وہی زبان، وہی بول چال، وہی رہن سہن، وہی مقامی لوگوں سے نفرت، وہی صدیوں پرانے دور غلامی کے قانون کے تحت یہ 'پبلک سرونٹ' یہاں وائسرائے بنے پھرتے ہیں۔

ضرورت اب اس بات کی ہے کہ جیسے ہم نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935ء سے نجات حاصل کر کے اپنا آئین بنا لیا تھا، ایسے ہی اب ہمیں انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947ء کی ذیلی شقوں سے باہر نکل کر سوچتے ہوئے اپنے آئین کے آرٹیکل 268 کی ذیلی دفعہ ایک میں تبدیلی کرنی چاہیے۔ ہمیں نئے اصولوں اور نئے قوانین کی ضرورت ہے۔ ہم اب رعایا نہیں، شہری ہیں۔

قائد اعظم کے انتقال کے بعد جب ملک اقتدار کے کھیل کا اکھاڑہ بنا تو اقتدار اور افسر شاہی کا ایسا رشتہ استوار ہو گیا کہ بالادست طبقات کو قوانین بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ پولیس سے وہی کام لیا جانے لگا جو دور غلامی میں برطانوی حکومت لیا کرتی تھی۔ قوانین کا اسی طرح

سوئے استعمال ہونے لگا، جیسے آزادی سے پہلے برطانوی دورِ غلامی میں ہوتا تھا۔ پولیس اسی طرح حکمران طبقے کے رحم وکرم پر تھی، جیسے برطانوی نوآبادیات میں ہوتی تھی۔

پاکستان میں فوجداری قانون بطور خاص توجہ طلب ہے۔ معاشرے کو اس قانون کی قباحتوں سے جب تک نجات نہیں مل جاتی تب تک ایک صحت مند سماج کی تشکیل ممکن ہی نہیں۔ اس قانون نے معاشرے کی فکر کو مفلوج کر رکھا ہے۔ یہ جو ہم 'تھانہ کچہری' کی سیاست کی اصطلاح سنتے ہیں یہ اصل میں اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ بالادست طبقات نے اس معاشرے کی فکر کو زنجیر سے جکڑ رکھا ہے۔ یہ زنجیر اس وقت تک نہیں ٹوٹ سکتی جب تک غلامی کی یادگار اس قانون کو بدل نہیں دیا جاتا۔

فوجداری قانون کی سکیم قابل غور ہے۔ یہ انسانی وقار اور انسانی آزادیوں سے متصادم ہے۔ اس قانون کی مبادیات میں شہری کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ محض رعایا ہے جو عزت نفس، شرف انسانیت اور وقار سے محروم ہے۔ آسان تفہیم کے لیے چند مثالیں میں آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔

اس قانون کی سکیم یہ ہے کہ الزام لگا اور پولیس نے آدمی کو گرفتار کر لیا۔ مقدمے میں حقیقت کے سامنے آنے اور باعزت بری ہونے یا سزا پانے سے پہلے جو 'مقامات آہ وفغاں' آتے ہیں وہ کسی بھی آدمی کو عزت نفس ہی سے نہیں، اس کے احساس سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ پولیس کو یہ بھی اختیار ہے وہ شک کی بنیاد پر کسی کو اٹھا لے۔ جھوٹے مقدمے میں پھنسا لے۔ سڑک پر گالم گلوچ شروع کر دے۔ جب پولیس کے احتساب کا کوئی بامعنی نظام ہی موجود نہیں ہے تو گویا اسے اس بات کی آزادی ہے وہ جب چاہے کسی کی عزت اچھال دے۔

اس فوجداری قانون کے بندوبست کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے اس کا قانون وانصاف سے تعلق ثانوی ہے، اس کا بنیادی وظیفہ یہ ہے کہ عوام (رعایا) کو ایسے چکر میں ڈال دو کہ اس کی ہڈیوں کے گودے تک ایک ان دیکھا خوف سرایت کر جائے۔

ایف آئی آر درج ہوتی ہے۔ سچی ہے یا جھوٹی، اس کا فیصلہ تو بہت بعد میں ہوتا ہے۔ فیصلے سے پہلے جو مراحل ہیں وہ قابل غور ہیں۔

پہلا مرحلہ گرفتاری کا ہے۔ آدمی گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ گرفتاری کے بعد پولیس پابند ہے کہ اسے چوبیس گھنٹے کے اندر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرے۔ یعنی پولیس کو بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی آدمی کو اٹھالے اور چوبیس گھنٹے کے لیے اس کی آزادی کو سلب کر لے۔ قانون کے الفاظ بظاہر ایسے ہیں کہ یہ گرفتار شدہ آدمی کے حق کی بات کی گئی ہے لیکن قانون کی روح یہ ہے کہ محض ایک الزام کی بنیاد پر کوئی بھی شخص پورے چوبیس گھنٹے کے لیے پولیس کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ آپ کہیں جا رہے ہیں، آپ کی شادی ہے، آپ کی والدہ بیمار ہے، آپ کا کوئی پیارا اسپتال میں ہے، آپ کا ہر لمحہ قیمتی ہے، آپ کسی دوسرے شہر میں ہیں، ان سب نزاکتوں سے قطع نظر پولیس کو یہ اختیار ہے الزام کا تکلف پورا کرے اور آپ کو چوبیس گھنٹے کا مہمان بنا لے۔ ان چوبیس گھنٹوں میں آپ پر کیا بیتتی ہے، کسی کو اس سے سروکار نہیں۔

یہ قانون 1898ء کا ہے۔ بارہ عشرے بیت گئے۔ صدی سے زیادہ کا وقت گزر گیا لیکن ہمارے چوبیس گھنٹے کم ہونے میں نہ آئے۔ جب یہ قانون بنا تھا اس وقت بھی اس کا مقصد یہی تھا کہ ان چوبیس گھنٹوں کے خوف سے معاشرہ سہا رہے۔ مغلوں کے دور میں گرفتار شدہ آدمی فوری طور پر قاضی کے پاس لے جایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ گرفتاری بھی قاضی کے حکم کے بغیر نہ ہوتی تھی۔

سنگین ترین جرائم میں جہاں قاضی کو بتانا ممکن نہ ہوتا گرفتاری کی جا سکتی تھی مگر پہلی فرصت میں قاضی کے پاس ملزم پیش کرنا ہوتا تھا، اب نیا قانون بنا۔ مہذب سفید فام قوم اپنے "White Man's Burden" کے تحت برصغیر کے لوگوں کو تہذیب سکھانے آئی اور اس کی آزادیوں کو پہلے ہی مرحلے میں سلب کر لیا گیا۔

وہ اور وقت تھا، نقل و حرکت کے ذرائع محدود تھے آج تو جدید دور ہے۔ ملزم گرفتار کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں اسے عدالت کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دور غلامی کے یہ چوبیس گھنٹے کم ہونے میں نہیں آ رہے؟ اسلام آباد، لاہور، کراچی، کوئٹہ، پشاور یا کسی بھی چھوٹے شہر یا گاؤں یا قصبے میں پولیس کسی کو گرفتار کرے اسے عدالت تک لے جانے میں کتنا وقت لگتا ہے؟ کیا چوبیس گھنٹے لگتے ہیں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ چوبیس گھنٹے کا نو آبادیاتی دورانیہ آج تک کم نہیں ہو سکا؟

مجموعہ ضابطہ فوجداری میں اس دورانیے کی شان نزول اور تعین دونوں موجود ہیں اور ان کا مطالعہ سوالات کا جواب دینے کے بجائے مزید سوالات پیدا کر دیتا ہے۔

دفعہ 60 میں لکھا ہے کہ جب کوئی پولیس افسر کسی کو گرفتار کرے گا تو غیر ضروری تاخیر کے بغیر اسے مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کرے گا۔

دفعہ 61 میں اس غیر ضروری تاخیر کی وضاحت کی گئی ہے اور کہا گیا کہ پولیس کسی گرفتار شدہ شخص کو چوبیس گھنٹے سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھ سکے گی اور اس دورانیے میں اسے مجسٹریٹ کے پاس پیش کیا جائے گا۔

اب الفاظ کا حسن ایسا ہے کہ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ قانون پولیس کے اختیارات پر ایک قدغن لگا رہا ہے اور عام شہریوں کے حق کا تحفظ کر رہا ہے لیکن عملی طور پر اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ عملی طور پر یہ قانون پولیس کو چوبیس گھنٹوں کا لائسنس دے رہا ہے۔

اس میں ایک اور قباحت بھی ہے۔ وہ یہ ہے قانون کی روح بالکل مختلف ہے اور عمل درآمد کی نوعیت بالکل الگ ہے۔ دفعہ 61 میں ہی وقت کے تعین کا فارمولا بھی دیا گیا اور کہا گیا ہے کہ ملزم کو عدالت تک لانے میں جو سفر ہو گا اس کا وقت ان چوبیس گھنٹوں میں شامل نہیں ہو گا۔ لیکن سفر کہاں سے کہاں تک ہو گا؟ لکھا ہے کہ:

"From the place of arrest to the Magistrate's court."

یعنی جہاں سے ملزم گرفتار ہوا اس جگہ سے عدالت تک کا سفر۔ تعبیرات اور شرح اس سے یقیناً مختلف ہو سکتی ہیں کہ گرفتاری کے اندراج وغیرہ کے مراحل میں تھانہ بھی آتا ہے لیکن قانون کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ جائے گرفتاری سے ملزم سیدھا عدالت لے جایا جائے گا۔ بیچ میں تھانے میں 'قیام و طعام اور خاطر تواضع' کی گنجائش نہیں ہو گی۔ تاہم اگر اس تعبیر پر یقین کیا جائے کہ گرفتاری کے بعد عدالت سے پہلے تھانہ منطقی طور پر آتا ہے تو پھر اس تعبیر کا بھی یقین کرنا ہو گا کہ تفتیش بھی اسی دورانیے میں ہونی چاہیے اور فزیکل ریمانڈ کا غیر ضروری سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔

گرفتاری کے بعد ریمانڈ کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ فزیکل ہو یا جوڈیشل، ہر دو صورتوں میں اس پر سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

گرفتار شدہ شخص تفتیش کے نام پر 15 روز تک کی مدت کے لیے پولیس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ مدت زیادہ سے زیادہ پندرہ دن تک کی ہو سکتی ہے۔ اسے فزیکل یعنی جسمانی ریمانڈ کہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ملزم ایک ہی بار پندرہ دن کے لیے پولیس کے حوالے کر دیا

جائے۔ یہ دو دن تین دن چار دن یعنی مختلف وقفوں کا ریمانڈ دیا جاتا ہے جس کی کل مدت پندرہ دن سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ابھی ملزم کو سزا نہیں ہوئی ہوتی بلکہ ابھی تو اس کے خلاف مقدمہ شروع نہیں ہوا ہوتا اور اس کی آزادی کو نصف ماہ تک کے لیے سلب کر دیا جاتا ہے۔ یعنی عملی طور پر یہ عدالت سے سزا سنائے جانے سے پہلے کی ایک سزا ہے جو کسی بھی شخص کو جھوٹا سچا الزام لگا کر دے دی جاتی ہے۔

اس مرحلے کے بعد پھر جوڈیشل ریمانڈ آتا ہے یعنی ملزم کو پولیس کی تحویل سے لے کر جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی وہی صورت حال ہوتی ہے کہ سزا تو دور کی بات ابھی مقدمہ شروع نہیں ہوا ہوتا اور آدمی جیل پہنچا دیا جاتا ہے۔

ایک اور ریمانڈ بھی ہے جس کا تعلق قانون سے نہیں، پریکٹس سے ہے۔ اسے مکینیکل ریمانڈ کہتے ہیں۔ یعنی ایک معمول کی طرح ملزم پکڑا گیا، عدالت کے سامنے پیش ہوا اور عدالت نے جسمانی ریمانڈ دے دیا۔ عام سے مقدمات میں بھی جسمانی ریمانڈ دیا جانا گویا ایک رسم سی بن چکی ہے۔ اس لیے اس روایت کو مکینیکل ریمانڈ کہا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں چوں کہ سوال پوچھا نہیں جاتا، عوام کی کوئی اہمیت نہیں اور پارلیمان ان امور سے لاتعلق ہے اس لیے ایسے کوئی اعداد و شمار دستیاب ہی نہیں کہ کس ضلع میں کتنے مقدمات میں جسمانی ریمانڈ دینے سے انکار کیا گیا اور کتنے مقدمات میں دے دیا گیا اور جہاں دے دیا گیا وہاں اس کا کل اوسط دورانیہ کتنا تھا۔ مشاہدہ البتہ یہی کہتا ہے کہ جسمانی ریمانڈ کی نوعیت اب مکینیکل ریمانڈ کی ہو چکی ہے۔

پولیس تشدد کا تعلق اسی جسمانی ریمانڈ سے ہے۔ ان ہی ایام میں ملزم پر تشدد ہوتا ہے۔ ایشین ہیومن رائٹس واچ کی رپورٹ کے مطابق جنسی تشدد تک کی شکایات موجود ہیں۔ ایشین ہیومن رائٹس واچ کا دعویٰ ہے کہ حوالات میں 'چھترول' کا بندوبست بھی ہوتا ہے اور اس کے لیے چمڑے کا بنا اور تیل میں بھگویا ہوا ایک 'چھتر' استعمال ہوتا ہے۔[1]

جب کبھی کوئی شخص حوالات میں تشدد سے مر جاتا ہے تو چند دن تک یہ خبر زیر بحث رہتی ہے، وہ بھی اس صورت میں اگر یہ خبر میڈیا میں آ جائے اور اتفاق سے موضوع بھی بن جائے۔ ورنہ زیر حراست تشدد، زیر حراست عصمت دری اور زیر حراست ہلاکتوں کی خبریں کہیں اندر کے صفحات پر شائع ہوتی ہیں اور شام سے پہلے دم توڑ دیتی ہیں۔ حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ وزارت قانون یا وزارت انسانی حقوق میں سے کسی کے پاس اعداد و شمار ہی دستیاب نہیں ہیں کہ آج تک کس صوبے کے کس ضلع میں زیر حراست تشدد کے کتنے واقعات رپورٹ ہوئے اور ان کی نوعیت کیا تھی۔ نہ ہی کبھی کسی نے پارلیمان میں کھڑے ہو کر متعلقہ وزارتوں سے یہ سوال پوچھا اور نہ ہی یہ سماجی روگ کبھی ہمارے قومی سیاسی بیانیے کا حصہ بن سکا۔ ہاں اتفاق سے کبھی یہ اشرافیہ خود پولیس کے ایسے ہی رویے کا شکار ہو جائے تو پھر البتہ بہت شور مچتا ہے۔ لیکن جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کے بارے میں آج بھی وہی بے نیازی ہے جو دور غلامی میں سامراج کے ہاں ہوا کرتی تھی۔

اس قانون کا ماخذ بھی برطانوی نو آبادیاتی نظام ہے۔ یہ اصطلاح اٹھارویں صدی کے آخر میں متعارف ہوئی اور بعد میں جب یہ قانون برصغیر میں نافذ کیا گیا تو اس کا یہی مقصد تھا کہ کسی بھی

[1] ایشین ہیومن رائٹس واچ، 24 جون 2011ء۔

گستاخ کو کسی بھی وجہ سے اٹھا کر نصف ماہ کے لیے حراست میں رکھ کر اس کو اور اس کے اہل خانہ کو وہ جسمانی اور معاشی سبق سکھا دیا جائے کہ بعد میں مقدمے سے بری بھی ہو جائے تو یہ سبق اس کے ساتھ جائے کہ انگریز سرکار کے حضور گستاخی کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔

یہی قانون اپنی ان ہی روایات کے ساتھ ہمارے فوجداری نظام میں بروئے کار آرہا ہے کہ مقدمہ بڑا ہو یا چھوٹا، اکثر ریمانڈ دے دیا جاتا ہے۔ مکینیکل ریمانڈ کے اس رجحان کی حوصلہ شکنی کرنا اور اس کے بارے میں واضح اور دوٹوک قانون سازی کرنا پارلیمان کا کام تھا۔ لیکن اس نے نہیں کیا تو اعلی عدالتوں نے اس معاملے کو دیکھا اور اس میں کچھ رہنما اصول وضع کیے۔ جیسے غلام سرور کیس میں جسٹس منیر خان نے فیصلے میں لکھا کہ مجسٹریٹ صاحبان ضابطہ فوجداری کی لازمی دفعات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ریمانڈ دے دیتے ہیں اور جسمانی ریمانڈ ایک معمول کی کارروائی سمجھ کر یوں دے دیا جاتا ہے جیسے پولیس سے تعاون کیا جا رہا ہو۔[2] جسٹس منیر خان لکھتے ہیں یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ مجسٹریٹ انسانوں کی آزادی سے ایک معمول کے طور پر کھیل رہے ہیں۔[3] جسٹس صاحب نے لکھا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ سمجھتے ہیں جیسے وہ کسی کو جوابدہ نہیں۔[4] چنانچہ ان کی رہنمائی کے لیے معزز عدالت نے کچھ اصول وضع کیے۔ ان میں سے پہلا اصول یہ تھا کہ جسمانی ریمانڈ صرف اس وقت دیا جائے جب مضبوط اور غیر معمولی وجوہات موجود ہوں۔[5]

---

[2] مقدمہ غلام سرور بنام سرکار، PCLJ 2588، 1884ء، لاہور۔

[3] ایضاً۔

[4] ایضاً۔

[5] ایضاً۔

ان ہدایات پر اور اس فیصلے پر کتنا عمل ہو رہا ہے، یہ اب ایک تحقیق طلب کام ہے۔ کسی متعلقہ حکومتی وزارت کے پاس کچھ اعداد و شمار ہوں تب ہی اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ سنگین مقدمات میں یا غیر معمولی صورت حال میں ریمانڈ دیا جانا ایک قابل فہم بات ہے لیکن معمول کے مقدمات میں ریمانڈ گاہے غیر ضروری مشق معلوم ہوتی ہے جو نظام قانون کے لیے بھی اضافی بوجھ کے سوا کچھ نہیں۔

اس ضمن میں چند باتیں غور طلب ہیں:

- جو آدمی دس یا بارہ پندرہ دن جسمانی ریمانڈ گزارنے کے بعد بے گناہ قرار پائے، اس کے ان ایام کے کرب اور اذیت کا حساب کون دے گا؟ کیا ملکی قانون میں کوئی نکتہ موجود ہے کہ اس شخص کو پہنچنے والی جسمانی اور ذہنی اذیت اور مالی نقصان کا ازالہ کیا جائے؟ اگر ایسا کچھ نہیں ہے تو کیا قانون سازوں کو اس نکتے پر غور کرتے ہوئے قانون سازی نہیں کرنی چاہیے۔ جسمانی ریمانڈ کا یہ دورانیہ نہ صرف اس شخص بلکہ اس کے اہل خانہ کے لیے بھی ایک اذیت سے کم نہیں ہے۔ جوڈیشل ریمانڈ بھی بعض صورتوں میں بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ بے گناہ قرار پانے پر انھیں اتنا حق تو ہونا چاہیے کہ وہ کچھ ریلیف لے سکیں۔ آخر اب وہ سلطنت برطانیہ کی غلام رعایا نہیں ہیں، ایک آزاد ملک کے باعزت شہری ہیں۔
- آج کے دور میں ایسی کیا تفتیش ہے جس کے لیے نصف ماہ کا دورانیہ چاہیے؟ ظاہر ہے کہ غیر معمولی حالات اور سنگین مقدمات کا معاملہ الگ ہے۔ لیکن عام مقدمات میں تفتیش کے لیے پولیس کو کتنا وقت چاہیے؟ اگر تفتیش کا معیار اچھا ہو اور پولیس اہلکار تربیت یافتہ ہوں تو اکثر صورتوں میں یہ چند گھنٹوں یا چند دنوں کا کام ہے۔ اس کی خاطر اتنے طویل وقت کے لیے کسی کو اس کی آزادی سے کیوں محروم کیا جائے؟

- تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ غیر معمولی حالات اور سنگین مقدمات کو چھوڑ کر دیگر مقدمات میں کسی کو تحویل میں لیے بغیر تفتیش کا عمل جاری رکھا جائے؟ ایسا تو نہیں ہوتا کہ پولیس چوبیس گھنٹے ہی حوالاتیوں سے تفتیش کرتی ہو گی۔ ظاہر ہے اس کا کوئی ایک دورانیہ ہو گا۔ تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ملزم سے کیس کے ابتدائی مرحلے میں ہی ضمانت طلب کر کے اس کو حسب ضرورت ایک خاص وقت پر تفتیش کا حصہ بننے کے لیے طلب کر لیا جائے اور پھر اسے گھر جانے دیا جائے۔ ہاں اگر اس کا رویہ عدم تعاون پر مبنی ہو تو پھر معاملے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اس صورت میں ضمانت بھی ضبط ہو سکتی ہے اور گرفتاری بھی ہو سکتی ہے۔
- ان معاشی حالات میں کوئی شخص اپنے کاروبار سے، اپنی نوکری سے (بالخصوص اگر وہ پرائیویٹ نوکری کر رہا ہو) دس پندرہ بیس دن کے لیے محض جھوٹے الزام پر دور کر دیا جاتا ہے تو اس کے مالیاتی اور معاشی نتائج اس کے لیے اور اس کے اہل خانہ کے لیے کتنے پریشان کن ہو سکتے ہیں، کیا اس پہلو پر بھی غور نہیں کرنا چاہیے؟
- پانچویں سوال کا تعلق انتظامی امور سے ہے۔ جو لوگ غیر ضروری جسمانی ریمانڈ پر حوالات میں رہتے ہیں، ان کے کھانے پینے کے اخراجات کون برداشت کرتا ہے؟ اس کا جواب عوام کے ٹیکس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟ تو کیا ایک بہتر قانون سازی سے یہ اخراجات بچائے نہیں جا سکتے؟ یا پھر کہیں ایسا تو نہیں کہ حوالات میں بند آدمی کی حیثیت 'میزبان' کی بنالی جاتی ہے؟ کیا کہیں کوئی حساب موجود ہے کہ تھانوں میں حوالاتیوں کے کھانوں پر سالانہ اخراجات کا حجم کیا ہے؟ نیز یہ کہ اخراجات تھانوں تک پہنچتے بھی ہیں یا اس سے پہلے ہی ادھر ادھر کر دیے جاتے ہیں؟ اس کی تفصیل کبھی تو قوم کے سامنے آنی چاہیے۔

جسمانی ریمانڈ کے بارے میں شعور اجتماعی کو بروئے کار آنا چاہیے اور دور غلامی کے اس قانون میں معنوی اصلاح ہونی چاہیے۔ جوڈیشل ریمانڈ کا معاملہ بھی اسی طرح پیچیدہ ہے۔ ابھی سزا نہیں ہوئی اور ملزم جیل میں ہے۔ اس سے متصل معاملات بھی قابل غور ہیں۔

جیلوں میں دو طرح کے قیدی ہیں۔ ایک سزا یافتہ اور دوسرے وہ جن کے مقدمات ابھی زیر سماعت ہیں۔ وزیر اعظم کی پرزنرز ریفارم کمیٹی کے مطابق ان قیدیوں میں سے 65 فیصد قیدی وہ ہیں جن کے مقدمات کا ابھی فیصلہ ہی نہیں ہوا۔ صرف 35 فیصد قیدی ایسے ہیں جو سزا یافتہ ہیں اور اپنی سزا کاٹ رہے ہیں۔[6] وفاقی محتسب سیکرٹریٹ کی جانب سے سپریم کورٹ میں پیش کی گئی رپورٹ کے مطابق پاکستان کی جیلوں میں گنجائش سے قریب پندرہ ہزار زیادہ قیدی موجود ہیں۔[7] جب کہ 46 ہزار قیدی وہ ہیں جن کے مقدمات کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔[8] ایمنسٹی انٹر نیشنل کے مطابق تین لوگوں کے لیے بنائے گئے سیل میں بسا اوقات پندرہ قیدی رکھے جاتے ہیں۔[9]

فرض کریں یہ 46 ہزار انڈر ٹرائل پرزنرز جیلوں میں نہ ہوتے یا کم از کم ان کی نصف تعداد جیلوں میں نہ ہوتی تو جیلوں پر پڑنے والا یہ اضافی بوجھ کتنا کم ہو جاتا۔ 46 ہزار قیدی معمولی

---

[6] حسنات ملک، "Under-trial Prisoners, Victims of slow judicial system"، ایکسپریس دی ٹری بیون، 10 فروری، 2020ء۔

[7] حسنات ملک، "Over 46000 under trial prisoners in Pakistani jails"، دی ایکسپریس ٹری بیون، 19 جنوری، 2020ء۔

[8] ایضاً۔

[9] ایمنیسٹی انٹرنیشنل اعلامیہ، "Pakistan: Overcrowding in Pakistan's prisons is a ticking time bomb"، 13 دسمبر، 2020ء۔

تعداد نہیں۔ ان پر قومی خزانے سے بھاری اخراجات صرف ہوتے ہیں۔ ان کے طبّی مسائل ہوتے ہیں۔ گنجائش سے زیادہ قیدی رکھنے کی صورت میں یہ مسائل مزید بڑھ جاتے ہیں۔ ہر قیدی کے لیے تو جیل میں خصوصی میڈیکل یونٹ قائم نہیں ہوتا۔ تصور کیجیے کہ باقی قیدی کس حال میں ہوتے ہوں گے۔ بالخصوص جب حبس کے دنوں میں لوڈشیڈنگ کے عالم میں تین بندوں کے لیے بنائے گئے سیل میں پندرہ لوگ قید ہوں۔ عام آدمی بیماری کے ہاتھوں مر جائے تو محض دو سطری خبر ہوتی ہے کیونکہ انسانی حقوق اور انتظامی مواخذہ، عملاً یہاں اجنبی تصورات ہیں۔

کرونا کی وبا پھیلی تو یہ مسئلہ کھل کر سامنے آگیا اور ایمنسٹی انٹر نیشنل سمیت متعدد حلقوں سے یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدی ہیں، وہاں ان کی حفاظت کا کیا بندوبست ہے۔ اسلام آباد ہائی کورٹ نے پری ٹرائل پرزنرز رہا کرنے کا حکم دیا لیکن سپریم کورٹ نے یہ ایسا کرنے سے روک دیا۔[10] پھر لاک ڈاؤن لگ گیا، ایمنسٹی انٹر نیشنل کا کہنا ہے کہ لاک ڈاؤن میں ضمانت کی درخواستوں پر سماعت کم ہو گئی تو نتیجہ یہ نکلا کہ اپریل 2020ء سے اگست 2020ء تک قیدیوں کی تعداد میں 8اعشاریہ 7فیصد اضافہ ہو گیا۔[11]

اس معاملے کا ایک اور سماجی پہلو بھی بہت اہم ہے۔ چوں کہ عوام کو علم ہے کہ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ تو بہت بعد میں جا کر عدالت میں ہونا ہے اور اس سے پہلے حوالات سے جیل تک کی تذلیل لازمی ہونی ہے۔ کوئی بے گناہ ہے تب بھی۔ اس سے سماج کی نفسیاتی تشکیل عدم توازن کا

[10] حسیب بھٹی، "SC suspends all high court decisions regarding release of under-trial prisoners due to virus fears" ڈان، 30مارچ 2020ء۔

[11] ایمنیسٹی انٹرنیشنل اعلامیہ، "Pakistan: Overcrowding in Pakistan's prisons is a ticking time bomb" 13دسمبر، 2020ء۔

شکار ہو جاتی ہے۔ شریف آدمی یہ سوچ کر خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ انصاف تو جانے کب ملے گا اس سے پہلے ہی حوالات اور جیل اس کی عزت کے درپے ہو جائیں گے۔ اس سے ایک پورا طرز عمل وجود میں آتا ہے اور یہی وہ طرز عمل ہے جو یہاں برطانوی سامراجی قوت کو مطلوب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1902ء کے پولیس کمیشن میں فروعی امور میں تو بہت نکتے اٹھائے گئے لیکن اس برطانوی فوجداری نظام کی جو اساس تھی اس واردات کو کم ہی موضوع بنایا گیا۔

فوجداری نظام کی اس پیچیدگی نے جھوٹے مقدمات درج کرانے کے رجحان کو بھی فروغ دیا ہے۔ جب لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ مقدمہ جھوٹا ہو یا سچا، مخالف فریق ریمانڈ کی اذیت سے تو دوچار ہو گا، کچھ دن حوالات میں بھی رہے گا اور جیل کا چکر بھی لگا آئے گا تو ان کی انا کی تسکین کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے۔ انھیں پھر اس سے غرض نہیں ہوتی کہ مقدمے کے اختتام پر سزا ہوتی ہے یا نہیں۔ سزا ہونے یا بری ہونے سے پہلے جو مراحل آتے ہیں وہی ان کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ چنانچہ پھر ایک وقوعے پر ایف آئی آر درج کراتے وقت وہ نصف درجن کے قریب ایسے لوگوں کا نام بھی ڈلوا آتے ہیں جن کا وقوعے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد ایسے لوگوں کو سزا دلوانا نہیں ہوتا بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ گرفتار ہوں، حوالات میں رہیں، جیل جائیں، ضمانتیں کروائیں، پیشیاں بھگتیں اور اس تھکا دینے والے اور تکلیف دہ عمل کے بعد رہا بھی ہو جائیں تو ان کی بلا سے۔

چنانچہ جھوٹے مقدمے درج ہوتے ہیں۔ پھر ضمانتوں کی درخواستوں کے دفتر کھلے پڑے ہوتے ہیں اور عدالتوں پر ایک غیر ضروری بوجھ پڑتا ہے۔ اگر اس معاملے کو پارلیمان دیکھے اور اس پر غور و فکر کرے تو صرف اس ایک پہلو میں مناسب قانون سازی سے پورا فوجداری کلچر تبدیل ہو سکتا ہے۔ ریمانڈ، کسی استثنائی صورت حال، کسی سنگین جرم اور غیر معمولی حالت میں تو

قابل قبول ہو سکتا ہے لیکن عام حالات میں اور معمول کے مقدمات میں یہ حقوق انسانی کی خلاف ورزی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسے اگر ایک ناگزیر برائی کے طور پر اختیار کرنا ہی ہے تو یہ تصور ہر لمحہ ساتھ رہنا چاہیے کہ ناگزیر ہی سہی لیکن یہ ہے برائی ہی، اسے معمول کا درجہ نہیں دینا چاہیے۔

دستور پاکستان میں شہریوں کو جو آزادیاں دی گئی ہیں، دور غلامی کے یہ نوآبادیاتی قوانین ان آزادیوں کو محدود تر کر دیتے ہیں۔ برطانوی نوآبادیاتی پولیس اور فوجداری نظام کا بنیادی مقصد چوں کہ سامراجی کنٹرول اور سیاسی مقاصد کا حصول تھا اس لیے اس قانون میں انسانی وقار، احترام اور آزادیوں کا تصور انتہائی محدود تھا اور عملی طور پر تو نہ ہونے کے برابر تھا۔

خوف پیدا کرنے کے لیے پولیس کو جو اختیارات دیے گئے ان کا اجمالی جائزہ تو ہم لے چکے۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ سماج کے شعور اجتماعی کو کچلنے کے لیے کیسے کیسے قوانین بنائے گئے تھے۔

برطانوی نوآبادیاتی دور میں آج کی طرح کے جدید ذرائع ابلاغ تو تھے نہیں کہ سوشل میڈیا پر اظہار خیال کیا جاتا، فیس بک پر بات کی جاتی اور ٹوئٹر پر ٹرینڈ چلائے جاتے۔ فرد کے سیاسی شعور کے اظہار کا بنیادی ذریعہ جلسے اور اجتماعات تھے۔ ان سے نبٹنے کے لیے ضابطہ فوجداری میں دفعہ 144 متعارف کرائی گئی۔ یہ جو آج کل ہم خبر سنتے ہیں کہ حزب اختلاف کے فلاں جلسے کو روکنے کے لیے دفعہ 144 نافذ کر دی گئی یہ وہی دفعہ ہے جو برطانیہ نے برصغیر پر اس کے دور غلامی میں مسلط کی تھی۔ اس کے نفاذ سے لے کر اب تک اس میں زیادہ مسئلہ اس دفعہ کے متن کا نہیں بلکہ اس کے استعمال کا ہے۔ یہ غلط استعمال برطانوی نوآبادیات کی روایت کے طور اس نظام کو ورثے میں آیا ہے۔ حزب اختلاف سیاسی جلسہ کرنے لگتی ہے تو خبر آ جاتی ہے دفعہ 144 لگا دی گئی ہے اس لیے پانچ یا اس سے زیادہ افراد کا اتنے عرصے کے لیے اکٹھا ہونا منع ہے۔

پولیس برطانوی دور کی طرح آج بھی حکمران کے تابع ہوتی ہے لہذا حسب فرمائش وہ کہہ دیتی ہے کہ امن عامہ کو خطرات لاحق ہیں اور یوں بظاہر قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے دفعہ 144 کے تحت شہری آزادیاں محدود کر دی جاتی ہیں۔

پولیس کو غیر معمولی اختیارات دے کر عوام میں خوف پھیلا کر اور، قانون میں ایسی پیچیدگیاں رکھ کر بھی کہ لوگوں کو جب جہاں چاہا سبق دکھا دیا، برطانوی نوآبادیاتی نظام کے اندر کا خوف ختم نہ ہو سکا۔ چنانچہ چند ہی سالوں بعد برطانیہ نے ہندوستان میں نافذ فوجداری قانون میں ایک نئی دفعہ ڈال دی۔ یہ دفعہ 124اے تھی۔ یہ بھی آج تک قائم و دائم ہے اور حکومت اپنے حریفوں کا ناطقہ بند کرنے پر تل جاتی ہے تو اسی سامراجی دفعہ کا سہارا لیتی ہے۔

تاجر کے روپ میں آ کر یہاں کی ریاست پر قبضہ کر کے، اس کے وسائل کو بے رحمی سے لوٹ کر، جو فوجداری قانون یہاں نافذ کیا گیا اس کے باب ششم کا عنوان رکھا گیا "ریاست کے خلاف جرائم"۔ لیکن اس سے بھی جی نہ بھرا۔ چنانچہ اس میں نئی دفعہ کا اضافہ کر دیا گیا کہ حکومت کی شان میں گستاخی بھی سنگین جرم ہوگا۔ اس قانون کے مطابق وفاقی یا صوبائی حکومتوں کے بارے میں نفرت آمیز گفتگو یا حتی کہ ان حکومتوں کی توہین بھی ایک جرم ہے اور حکومتوں سے "Disloyalty" اور "Disaffection" کو بھی جرم قرار دیا گیا ہے۔ حکومت کو بھی گویا ریاست کا تقدس دے دیا گیا۔ آج جو کہا جاتا ہے کہ سڑک پر کھڑا سپاہی بھی ریاست ہے، یہ اسی جورسپروڈنس کا فکری ورثہ ہے۔ سپاہی بھی ریاست ہے اور حکومت بھی ریاست ہے، بس عوام ہی شناخت کے بحران سے دوچار ہیں۔

دستور پاکستان کی روح اس سے بالکل مختلف ہے۔ آئین کے آرٹیکل 7 میں صرف بنیادی حقوق اور پالیسی کے رہنما اصولوں کی حد تک یہ قرار دیا گیا کہ یہاں وفاقی حکومت، پارلیمان،

صوبائی حکومت، صوبائی اسمبلیوں اور ہر اس ادارے کو ریاست سمجھا جائے گا جو ٹیکس عائد کرنے کا اختیار رکھتا ہو۔ ذمہ داری کے تعین میں قطعیت کے لیے صرف اس دائرہ کار کے اندر ریاست کا یہ معنی ہے۔ عام حالات میں حکومت الگ چیز ہے اور ریاست الگ۔

1857ء کے بعد مسلح مزاحمت تو پہلے ہی کچلی جا چکی تھی۔ اب 1870ء میں سیاسی مزاحمت اور تنقید سے بے زار ہو کر برطانیہ نے ایک نیا قانون بنایا کہ اب صرف ریاست سے نہیں برطانوی حکومت سے بھی وفاداری لازم ہے اور اب برطانوی حکومت پر غیر وفادارانہ تنقید کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ نیز یہ کہ حکومت کی توہین بھی ایسا ہی سنگین جرم سمجھا جائے گا جیسے ریاست کے خلاف کوئی جرم سرزد کیا گیا ہے۔ یہ اہتمام غیر معمولی ہے کہ توہین حکومت کے خلاف بنایا گیا یہ قانون اسی باب میں درج کیا گیا جو 'ریاست کے خلاف جرائم' سے متعلق تھا۔

اس قانون کے اطلاق کے وقت، یعنی جب برطانیہ کی حکومت ہند نے اپنے ہی نافذ کردہ انڈین پینل کوڈ میں ترمیم کرتے ہوئے اس نئی شق کا اضافہ کیا، کہا گیا کہ جی ہم سے غلطی ہو گئی تھی۔ لارڈ میکالے صاحب نے بہت پہلے جو انڈین پینل کوڈ تیار کیا تھا، یہ دفعہ اس مسودے کا حصہ تھی لیکن اس وقت غلطی سے اسے قانونی دستاویز کا حصہ نہ بنایا جا سکا تو اب اسے ہم شامل کر رہے ہیں۔[12] گویا جو ہمیں مدون قانون دینے آئے تھے ان کی کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ انھیں یہ خبر ملنے میں دس سال لگ گئے کہ جناب لارڈ میکالے صاحب کا بنایا تعزیرات ہند ادھورا ہے اور اس میں ایک اہم دفعہ تو شامل ہی نہیں کی گئی۔

[12] کرشنا دیوگاور، *Textbook on the Indian Penal Code* (دہلی: یونی ورسل لاء پبلشنگ کمپنی، 2011ء)، 226۔

یہ عذر کیوں اختیار کیا گیا؟ حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ جب مقامی لوگوں سے پوچھے بغیر، ان سے مشاورت کیے بغیر، اپنے مفادات کی خاطر پورا فوجداری نظام کھڑا کر لیا گیا تھا تو اب اس میں ایک دفعہ کا اضافہ ایسی کون سی انہونی تھی کہ اس کی ایسی شان نزول بیان کی جاتی۔

تاہم امکان یہ ہے کہ ایسا برطانوی نوآبادیاتی بندوبست نے خود کو سبکی سے بچانے کے لیے کیا تھا۔ رپورٹس تیار ہو رہی تھیں کہ انگریزی عمل سے مقامی باشندے بہت خوش ہیں تو ایسے میں اس حقیقت کا اعتراف گوارا نہ تھا کہ ہمارے سامراجی بندوبست کو اب بھی چیلنجز کا سامنا ہے اور ہم اتنے نازک مزاج ہیں کہ ہم سے ہلکی سی تنقید بھی اب برداشت نہیں ہوتی اس لیے ہم اب نیا قانون لا رہے ہیں۔ یہ بات مگر اب بالکل واضح ہو چکی ہے کہ تحریک مجاہدین کو بے رحمی سے کچلنے کے بعد مسلمان علما، واعظین اور اہل قلم کی تنقید کا خوف تھا جس نے یہ قانون متعارف کرایا۔[13] چترا نشول سنہا کا کہنا ہے کہ یہ قانون اس سے پہلے برصغیر کی تاریخ میں کبھی بھی نافذ نہیں رہا۔

قانون کی اس دفعہ کے مطابق اگر کوئی شخص زبانی طور پر یا تحریری طور پر یا اشاروں سے یا کسی بھی ظاہری شکل میں وفاقی یا صوبائی حکومتوں کے بارے میں نفرت پیدا کرتا ہے یا ان کی توہین کرتا ہے یا ان کے بارے میں عدم وفاداری پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ جرم ہوگا۔

اس کی وضاحت کرتے ہوئے اسی قانون میں لکھا گیا کہ "Disaffection" کا مطلب "Disloyalty" بھی ہوگا۔ یعنی اگر کوئی شخص کچھ ایسا کر دے جس سے لگے کہ وہ حکومت کا وفادار نہیں رہا تو قانون اس پر گرفت کرے گا۔ اگرچہ بعد میں اس کی شرح میں یہ تاویل کی گئی کہ

[13] چترانسول سنہا، "The Roots of this Law"، بنگلورمرر، 23 جولائی، 2019ء۔

حکومت کا "Loyal" نہ ہونا الگ چیز ہے اور "Disloyal" ہونا الگ چیز ہے اور قانون کا مطلوب یہ نہیں کہ آپ حکومت کے "Loyal" ہوں بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ حکومت سے "Disloyal" نہ ہوں۔ تاہم یہ تاویل بھی اس سوچ کو چھپانے میں ناکام ہے جو اس قانون سازی کے پیچھے کام کر رہی تھی۔ مزید وضاحت میں بتایا گیا ہے کہ اگر کسی کو کسی قانون پر کوئی اعتراض ہو تو وہ اس قانون میں تبدیلی کے لیے اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے اگر اس نے حکومت کی توہین کر دی یا حکومت سے نفرت کا اظہار کر دیا یا اس سے عدم وفاداری کے جذبات ظاہر کر دیے تو وہ بھی قانون کی گرفت میں آئے گا۔

اسی طرح حکومت کے کسی انتظامی یا دیگر اقدامات پر ایسے تبصرے، جن میں حکومت کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات ہوں یا نفرت ہو یا توہین ہو تو وہ بھی جرم ہوگا۔

چنانچہ جب بنگال لیجسلیٹو کونسل میں یہ قانون بنا کہ ایک لڑکی اور لڑکے کی شادی کی عمر کیا ہونی چاہیے اور بنگالی اخبار 'بنگو باسی' نے اس قانون پر تنقید کی تو اخبار کے مدیر پر یہ دفعہ لگا دی گئی۔[14] ایسے مقدمات کی ایک طویل دستیاب فہرست ہے جو برطانوی راج میں حکومت کی 'توہین' پر قائم کیے گئے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی تحریک مجاہدین نے اپنا سیٹ اپ ختم کرنے کا اعلان کر دیا کہ چوں کہ اب مسلمانوں کی ریاست بن گئی ہے اس لیے اب ہماری مزاحمت ختم ہو رہی ہے۔ اب اس تنظیم کی ضرورت نہیں رہی۔[15] لیکن

[14] چترانسول سنہا، "The Roots of this Law"، بنگلور مرر، 23 جولائی، 2019ء۔

[15] ڈاکٹر قیام الدین احمد، ہندوستان میں وہابی تحریک، ترجمہ: پروفیسر محمد سلیم عظیم آبادی (کراچی: نفیس اکیڈمی، 1980ء)، 13۔

اس تحریک کے خلاف انگریز نے جو قانون بنایا تھا وہ ابھی تک رائج ہے۔ اور اب اس کی زد میں ہمارے اپنے اہل سیاست آتے رہتے ہیں۔

پاکستان میں رائج نوآبادیاتی دور کا یہ قانون پاکستان کے آئین سے واضح طور پر متصادم ہے۔ آئین پاکستان کا آرٹیکل 19 اظہار رائے کی آزادی دیتا ہے۔ اسی آرٹیکل میں اظہار رائے کی اس آزادی کی حدود بھی بیان کر دی گئی ہیں اور وہاں کہیں نہیں لکھا کہ حکومت کی توہین کی اجازت نہیں ہوگی یا حکومت سے وفاداری شہریت کا بنیادی تقاضا سمجھا جائے گا۔ متفقہ آئین تو بالآخر بنا لیا گیا لیکن نوآبادیاتی دور کے قوانین کو اس آئین کے تابع لانے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ وفاداری حکومت سے نہیں، ریاست سے ہوتی ہے اور حکومت ریاست نہیں ہوتی۔ آئین پاکستان کے آرٹیکل 5 میں لکھا ہے کہ ریاست سے وفاداری ہر شہری کا بنیادی فریضہ ہے۔ آئین میں صرف ریاست سے "Loyalty" کی بات کی گئی، حکومت سے نہیں۔

ایک اور قابل غور پہلو یہ ہے کہ اسی آرٹیکل میں، جہاں ریاست سے وفاداری کی بات کی گئی ہے وہیں "Obedience to the Constitution" یعنی آئین کی اطاعت کی بات کی گئی۔ آئین سے وفاداری کا نہیں کہا گیا۔ آئین کی اطاعت کا کہا گیا ہے۔ البتہ ریاست سے وفاداری کی بات کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ ریاست اور آئین دونوں سے وفاداری کا بھی تو کہا جا سکتا تھا؟

یہ اس لیے ہے کہ ریاست ایک ایسا وجود ہے جس سے صرف وفاداری ہو گی۔ اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دی جائے گی۔ اس کے تحفظ کے لیے جان بھی قربان کر دی جائے گی۔ لیکن

آئین کا احترام ہو گا، مگر آئین کو آئین میں درج طریقہ کار کے تحت تبدیل بھی کیا جاسکے گا۔ وفاداری اور احترام میں یہی فرق ہے۔

وفاداری بالکل ایک الگ چیز ہے اور احترام ایک الگ چیز۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آئین کی حرمت نہیں ہے۔ اگلے ہی آرٹیکل یعنی آرٹیکل 6 میں آئین شکنی کی سزا موت ہے اور اسے سنگین غداری (High Treason) قرار دیا گیا ہے

حکومت اس مقابلے میں کہاں کھڑی ہے؟ اس پر تو تنقید بھی ہو گی اور اسے عدم اعتماد کے ذریعے ہٹایا بھی جاسکے گا۔ حکومت کی غلطی پر سرعام گرفت ہو گی۔ حزب اختلاف کا اور کام کیا ہے؟ یہی ہے کہ حکومت کی غلطیوں پر گرفت کرے اور اصلاح اور متبادل پر متوجہ کرے۔ اب اگر حزب اختلاف سے کہا جائے کہ حکومت کے وفادار بن کر رہو ورنہ سزا کے لیے تیار ہو جاؤ تو کیا آئین اور جمہوریت کی دنیا میں اس رویے کا کوئی اعتبار ہو گا؟

پاکستان کے آئین نے اگر خود آئین کے لیے وفاداری کا مطالبہ نہیں کیا، احترام کا مطالبہ کیا ہے تو نوآبادیاتی قانون کے تحت حکومت اپنی وفاداری کا مطالبہ کیسے کر سکتی ہے؟ کلائر وارڈ نے برطانوی وزارت انصاف کے پارلیمانی انڈر سیکرٹری برائے سٹیٹ کے طور پر 1997ء میں کہا تھا کہ یہ قانون پرانے وقتوں کی بات ہے جب آزادی رائے کا کوئی تصور نہیں تھا۔[16]

اس قانون کی شرح سر سید احمد خان نے اسباب بغاوت ہند میں پہلے ہی بیان کر دی تھی۔ وہ بتاتے ہیں کہ گورنمنٹ سے سرکشی کے معنی کیا ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"سرکشی کے کیا معنی ہیں؟ جان لو کہ اپنی حکومت کا مقابلہ کرنا یا مخالفوں کے ساتھ شریک ہو جانا

16 دی سکاٹس مین، 15 نومبر، 2019ء۔

یا مخالفانہ ارادے سے حکم نہ ماننا اور نہ بجالانا یا نڈر ہو کر گورمنٹ [گورنمنٹ] کے حقوق اور حدود کو توڑنا سرکشی ہے۔ مثلاً:

1. نوکر یا رعیت کا اپنی حکومت سے لڑنا۔
2. یا مخالفت کے ارادے سے حکم کا نہ ماننا یا نہ بجالانا۔
3. یا مخالفوں کی مدد کرنا اور ان کے شریک ہونا۔
4. یا رعیت کا نڈر ہو کر آپس میں لڑنا اور حد معینہ گورمنٹ سے تجاوز کرنا۔
5. یا اپنی گورمنٹ کی محبت اور خیر خواہی دل میں نہ رکھنا اور مصیبت کے وقت طرفداری نہ کرنا۔"[17]

ممکن ہے سر سید احمد خان کے پیش نظر مسلمانوں کی خیر خواہی ہی ہو اور اس زمانے میں ہو سکتا ہے بات کہنے کی اتنی ہی گنجائش ہو اور اسی اسلوب میں ہی بات کہنا ممکن ہو لیکن معاملہ یہ ہے کہ وہ دور غلامی اب ختم ہو چکا۔ اب ہم پاکستان کی آزاد اور خود مختار ریاست کے شہری ہیں۔ ہم اب کسی 'گورنمنٹ' اور حاکم کے 'نوکر' یا 'رعیت' نہیں ہیں۔ وقت بدل چکا ہے تو قانون بھی تبدیل ہونا چاہیے۔ اہم بات یہ ہے کہ بھارت کی سپریم کورٹ میں بھی یہ معاملہ زیر سماعت ہے اور اس نے حتمی فیصلہ آنے تک "Sedition" کے قانون کا اطلاق معطل کر رکھا ہے۔[18]

نوآبادیاتی نظام قانون کی روح ہمارے سامنے ہے۔ فرد کی آزادی کا کوئی تصور نہیں۔ جب چاہے اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے اور مقدمے کے سچے یا جھوٹے ہونے سے قطع نظر اسے

17 سر سید احمد خان، اسباب بغاوت ہند (کراچی: سندھ اردو اکیڈمی، 1987ء)، 94-95۔

18 "India's Supreme Court puts controversial law on hold"، بی بی سی، 11 مئی، 2022ء۔

حوالات اور جیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ قانون کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اس اذیت کے بعد وہ بے گناہ قرار دیا جائے تو ازالے کی صورت کیا ہو گی۔ قانون لوگوں کو اظہار کی آزادی بھی نہیں دیتا۔ حکومت کی توہین پر یا اس سے وفاداری نہ دکھانے پر عمر قید تک کی سزا دی جاسکتی ہے۔ اس پر زیر حراست تشدد ہو تو یہ نظام قانون انصاف کے بجائے ثبوت کی بھول بھلیوں میں ایسی بے نیازی سے مٹر گشت کرنے نکل جاتا ہے کہ مظلوم کی کمر دہری ہو جاتی ہے۔ تصور کریں کہ حوالات میں جس پر تشدد ہو وہ ثبوت کہاں سے لائے۔ یعنی غیر اعلانیہ اہتمام یہ ہے کہ ریمانڈ میں ہڈی سلامت رہے تو باقی سب گوارا ہے۔

انسان کی شخصی آزادی اور اظہار رائے کو محدود تر کر دینے کے بعد، اب آتے ہیں اس نکتے کی جانب کہ نوآبادیاتی قانون میں لوگوں کی جائیداد کے ساتھ کیسا 'حسن سلوک' کیا گیا ہے۔

برطانوی راج میں لوگوں کی جائیداد ان کی مرضی کے بغیر چھین لینے کے عمل کو قانونی شکل 1824ء میں دی گئی۔ اصول یہ طے ہوا کہ نمک کی مینوفیکچرنگ اور سڑکوں وغیرہ اور مفاد عامہ کے لیے حکومت کسی کی بھی زمین اس کی مرضی کے بغیر لے سکتی ہے۔ بس بدلے میں ایک 'مناسب قیمت' ادا کرنا ہو گی۔ مناسب قیمت کیا ہو گی اور اس کا تعین کون کرے گا اور مفاد عامہ کا کام کیا ہو گا، یہ خالصتاً مبہم رکھا گیا تاکہ مرضی کی تعبیر کی وسیع تر گنجائش موجود رہے۔

یہی قانون 1850ء میں کلکتہ اور بمبئی میں بھی لاگو کر دیا گیا۔ پھر ایک قانون 1857ء میں لایا گیا۔ اسے لینڈ ایکوی زیشن ایکٹ، 1857ء کہا جاتا ہے۔ کچھ وقت گزرا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو خیال آیا کہ قانون میں تو کمی رہ گئی ہے اور مال مفت میں پرائیویٹ شراکت داروں کے لیے بھی گنجائش رکھنی چاہیے تھی۔ چنانچہ 1861ء میں ایک قانون آیا۔ دو سال بعد 1863ء

میں ایک اور ایکٹ لایا گیا۔ اب نجی کمپنیاں بھی مجاز ہو گئی تھیں کہ کسی کی زمین پر ہاتھ رکھیں اور قانونی طور اس سے زمین چھین لیں، صرف 'مناسب قیمت' ادا کر کے۔

اس سارے عمل میں جو قانونی طریقہ کار وضع کیا گیا وہ مجموعہ نقائص تھا۔ زمین کی قیمت کا تعین کلکٹر کی نگرانی میں فریقین کی رضامندی سے ہوتا۔ یہ رضامندی کیسے حاصل کی جاتی ہو گی، کامن لاء کا ادنی سا طالب علم بھی اس واردات کو بخوبی جان سکتا ہے۔ اگر فریقین باہم رضامند نہ ہو پاتے تو پھر ثالث (Arbitrator) کے پاس معاملہ جاتا جس کا تعین بھی حکومت کرتی۔ ثالث جو بھی فیصلہ کر دیتا وہ حتمی تصور ہوتا۔ ثالث کے فیصلے کے خلاف اپیل کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔

تھوڑا وقت گزرا تو ایک اور قانون آ گیا۔ یہ لینڈ ایکوی زیشن ایکٹ 1870ء کہا جاتا ہے۔ اس میں معاملات میں عدلیہ کا کردار بھی وضع کر دیا گیا۔ 1894ء میں ایک نیا ایکٹ آ گیا اور اب یہ طے ہوا کہ ریاست تو مفاد عامہ کے تحت زمین لے ہی سکتی ہے اب کمپنی بھی زمین لے سکے گی۔ 1894ء یہی لینڈ ایکوی زیشن ایکٹ آج تک پاکستان میں نافذ العمل ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ اسلامی اصولوں سے بھی متصادم ہے اور دستور پاکستان کی روح سے بھی۔

اس قانون کی نظر میں عوام کی، ان کی جائیداد کی، ان کے مستقبل کی، ان کے معاشی امکانات کی کوئی حیثیت نہیں۔ چنانچہ قانون صرف اتنا کہتا ہے کہ جس کی زمین لینی ہو مناسب سی قیمت دو اور لے لو۔ سوال یہ ہے کہ جس کی زمین اس قانون کے تحت لی جاتی ہے اسے صرف compensation کیوں دی جائے؟ اگر زمین کے اس ٹکڑے سے اس کا روزگار وابستہ ہو اور اس کے مستقبل کے معاشی امکانات اس ٹکڑے سے جڑے ہوں تو کیا شہریوں کا یہ حق نہیں کہ

انھیں متبادل جگہ پر باقاعدہ آباد بھی کیا جائے اور ان کے ویسے ہی معاشی امکانات بھی مہیا کیے جائیں؟

یہ وہ پہلو ہے جس سے قابض برطانوی قانون سازوں کو ہو سکتا ہے کوئی غرض نہ ہو کیونکہ ان کے مقاصد کچھ اور تھے۔ لیکن اب جب ہم آزاد ہو چکے ہیں اور ہماری اپنی پارلیمان ہے، ہم محکوم نہیں، غلام نہیں، اپنی ہی ریاست کے برابر کے شہری ہیں تو پھر یہ پہلو کیسے نظر انداز ہو سکتا ہے؟

دلچسپ بات یہ ہے کہ پڑوس میں بھارت نے اس پہلو پر قانون سازی کر لی ہے۔ لینڈ ایکوی زیشن ایکٹ، 1894ء منسوخ کر دیا ہے اور 2013ء میں نیا قانون متعارف کرا دیا ہے جو ایسے لوگوں کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے جن کی زمین لی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان میں ایسی قانون سازی کیوں نہیں ہو سکتی؟ '

یہاں ایک اور پہلو بڑا تکلیف دہ ہے۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام نے لینڈ ایکوی زیشن ایکٹ کو جہاں چھوڑا، ہم نے آزادی کے بعد اسے ختم کرنے کے بجائے اس کا دائرہ کار مزید پھیلا دیا اور اسے پہلے سے زیادہ سنگین بنا دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر برطانوی حکومت کے دور میں تو مفاد عامہ کے لیے زمین لی جا سکتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارے قانون سازوں نے یہ کیا کہ مفاد عامہ کا دائرہ کار تنگ کرنے کے بجائے ہاؤسنگ کالونیوں کو بھی مفاد عامہ کے دائرے میں شامل کر لیا اور قانون بنا دیا کہ ہاؤسنگ کالونی بنانے کے لیے بھی زمین ایکوائر کی جا سکتی ہے۔ پنجاب لینڈ ایکوی زیشن ایکٹ (ہاؤسنگ) 1973ء اور پنجاب لینڈ ایکویزیشن (ہاؤسنگ) رولز، 1973ء کے تحت اب ہاؤسنگ سکیم کے لیے بھی زمین ایکوائر کی جا سکتی

ہے۔ یعنی اب کسی سیٹھ یا دولت مند کا رہائشی منصوبہ بھی ہمارے قانون سازوں نے 'مفاد عامہ' میں شامل کر دیا ہے۔

اس قانون کے جو عملی آزار ہیں وہ بیان کے محتاج نہیں۔ ملک کے طول و عرض میں غریب دیہاتیوں کے ساتھ اس قانون کی آڑ میں جو ظلم کیا گیا، وہ ایک تکلیف دہ باب ہے۔ اس سارے کھیل میں صرف بالادست طبقات کے مفادات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جنھیں معمولی سی رقم دے کر بے دخل کر دیا جاتا ہے، ان اصل مالکان کی فلاح اور آبادکاری کسی کی ترجیح نہیں ہوتی۔

یہ المیہ اس سفید فام قوم کی قانونی وراثت ہے جو برصغیر میں ہمیں تہذیب سکھانے آئی تھی۔ آنے والے تو چلے گئے لیکن یہ قانونی بندوبست آج تک ختم نہیں ہو سکا۔

یعنی اس نوآبادیاتی قانونی بندوبست کی مروجہ باقیات میں نہ شخصی آزادی محفوظ ہے نہ ہی عملاً آزادی رائے دستیاب ہے اور نہ ہی کسی کی جائیداد کو تحفظ حاصل ہے۔ آپ بعد میں بے گناہ بھی ثابت ہو جائیں لیکن قانونی پیچیدگیاں تب تک آپ کو نفسیاتی عدم توازن سے دوچار کر چکی ہوں گی۔ آپ آرٹیکل 19 کے تحت آزادی رائے کی دہائی دیتے رہیں آپ کو توہین حکومت کے جرم میں گرفتار کیا جا سکتا ہے اور آپ حق ملکیت پر قرآن و سنت، آئین اور عدالتی فیصلوں کے حوالے دیتے رہیں آپ کو کسی نجی ہاؤسنگ سوسائٹی تک کی بھینٹ چڑھا کر آپ کے گاؤں کے گاؤں آپ سے چھینے جا سکتے ہیں۔

یہی وہ بنیادی ڈھانچہ ہے جو اس بات کا تعین کرتا ہے کہ رہنے والے یہاں کے شہری ہیں یا ان سے رعایا جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ نوآبادیاتی قانون کا یہ ڈھانچہ شہریوں کو شہری نہیں رعیت سمجھتا ہے۔ اس بنیادی شرف شہریت سے محروم رعایا البتہ اس بات پر خوش ہونا چاہے تو ہو سکتی ہے

کہ یہ نوآبادیاتی قانون 'مدون' (Codified) سا تو ہے، اور اس کے پیچھے قوت نافذہ بھی موجود ہے۔

قانون کا مدون ہونا ہی اس کی وجاہت کا پیمانہ ہے تو پھر انگلینڈ اور ویلز کا فوجداری قانون مدون کیوں نہیں ہے؟ یہ کیا معاملہ ہے کہ جنھوں نے برصغیر کو 1860ء میں ایک مدون فوجداری قانون دیا تھا وہ اپنے انگلینڈ اور ویلز کے لیے آج تک فوجداری قانون کو مدون نہیں کر سکے؟

یہی نہیں بلکہ راؤل وین سین ایجم کا دعویٰ ہے کہ برطانوی قانون میں اگر کوئی خوبی اور خاصیت ہے تو وہ یہی کہ وہ غیر مدون ہے یعنی کوڈیفائیڈ نہیں ہے۔[19] لیکن سر میتھیو ہیل ایک بالکل الگ کہانی سناتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کامن لاء ججوں کے فیصلوں پر مشتمل قانون نہیں بلکہ یہ سارے قدیم قوانین باقاعدہ پارلیمان نے بنائے تھے اور مدون تھے، بس ہوا کہ ان کے نسخے گم ہو گئے۔[20] میتھیو ہیل کامن لاء کی سب سے بڑی عدالت کنگز بنچ کے چیف جسٹس رہے اور 1676ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی کتاب *The History of the Common Law of England* ان کی وفات کے بعد 1713ء میں شائع ہوئی۔ یعنی اس زمانے میں بھی یہ قیمتی دستاویزات 'گم' ہو چکی تھیں اور ساری کی ساری ہی گم ہو چکی تھیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے وجود اور گمشدگی کی خبر بھی صرف سر میتھیو ہیل کو تھی۔

[19] راؤل وین سین ایجم، *Judges, Legislatures and Professors* (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، 1987ء)، 39۔

[20] سر میتھیو ہیل، *The History of the Common law of England* (امریکا: شکاگو یونی ورسٹی پریس، 1971ء)، 4۔

کامن لاء کو جج میڈ لاء بھی کہا جاتا ہے اور اس پہلو کی ایک شرح معروف برطانوی فلسفی اور ماہر قانون جیرمی بینتھم نے یوں پیش کی کہ یہ ایسا قانون ہے جیسے کوئی مالک اپنے کتے کے لیے کوئی ضابطہ بنا لے۔[21] انھوں نے اس کے لیے باسٹرڈ لاء کی اصطلاح استعمال کی ہے۔[22]

اپنے قوانین مدون (Codify) کرنے کے لیے برطانیہ نے 1833ء میں رائل کمیشن آن کرمنل لاء تشکیل دیا۔ اسے کمیشن سے کہا گیا کہ قانون کی مکمل تدوین (Codification) ممکن بنائے۔ اس کمیشن کے ممبران میں سے ایک جان آسٹن بھی تھے۔ اس کمیشن نے دس سال سے زیادہ عرصہ لگایا اور آٹھ جلدوں پر مشتمل رپورٹ بھی پیش کی لیکن قانون مدون نہ ہو سکا۔ مزید دل چسپ بات یہ ہے کہ کمیشن نے 1834ء میں جب پہلی رپورٹ پیش کی تو قوانین کو مدون کرنے کی افادیت کو تسلیم کیا۔ لیکن جب 1843ء میں ساتویں رپورٹ پیش کی تو اس رائے سے رجوع کر لیا۔ جب اس کمیشن کی ناکامی پر تنقید ہوئی تو کمیشن کے ایک رکن اینڈریو اموس نے کہا کہ ناقدین کو 'کوڈیفوبیا' ہو چکا ہے۔[23] یہ بحث مگر برطانیہ میں چلتی رہی اور ایک کمیشن 2009ء میں ایک بار پھر بنایا گیا کہ وہ کرمنل لاء کو مدون کر دے لیکن تاحال معاملات جوں کے توں ہیں۔

[21] جیرمی بینتھم، *Truth versus Ashhurst* (لندن ایڈنبرا: ٹیٹ سمپکن، مارشل، 1843ء)، 5۔

[22] ایضاً

[23] ڈیوڈ لائبرمین، "The Challenge of Codification in English Legal History," Presentation for the Research Institute of Economy, Trade and Industry (RIETI)، 12 جولائی، 2009ء۔

چنانچہ ڈیوڈ لائبر مین کے مطابق برطانوی وکلاء کی ہدایات کے تحت، ایک تجربے کے طور پر، برطانیہ نے ہندوستان میں فوجداری قوانین، ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت کو مدون کر دیا لیکن یہ تدوین(Codification) برطانیہ میں نہیں کی گئی۔[24]

ہمارا نوآبادیاتی احساس کمتری البتہ آج بھی اس بات پر نازاں ہے کہ برطانیہ نے ہمیں مدون قوانین عطا فرما کر بندہ پروری کی۔

24 ایضاً۔

باب ششم

نظام قانون یا نظریہ غلامی؟

پاکستان کی آئینی اور پارلیمانی تاریخ کے سب سے بڑے آزار کا عنوان بھی نوآبادیاتی نظریہ محکومی ہے، جب پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی (پارلیمان) کو گورنر جنرل غلام محمد نے توڑ دیا اور فیڈرل کورٹ (سپریم کورٹ) نے گورنر جنرل کے اس اقدام کی توثیق کر دی۔ پاکستان آج تک اس کے اثرات سے باہر نہیں نکل پایا۔ اگر ہم معاملے کو اس کے سیاق و سباق میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے جسٹس منیر کے اس فیصلے کا عنوان 'نوآبادیاتی دور کا احساس کمتری' ہونا چاہیے۔ یہ بنیادی طور پر نظریہ غلامی تھا۔

گورنر جنرل کے اس اقدام کو جب عدالت میں چیلنج کیا گیا تو گورنر جنرل نے عدالت میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ پاکستان ابھی تک ایک آزاد اور خود مختار ریاست نہیں ہے اور وطن عزیز میں حاکمیت اعلیٰ تو برطانوی ملکہ الزبتھ کے پاس ہے۔ اس لیے دستور ساز اسمبلی کے کسی قانون، کسی ایکٹ، کسی آئین کی کوئی حیثیت نہیں جب تک ملکہ معظمہ الزبتھ کے نمائندے گورنر جنرل غلام محمد اس کی توثیق نہ فرمادیں اور چوں کہ گورنر جنرل صاحب ملکہ معظمہ کے نمائندے ہیں اس لیے اگر انھوں نے پوری کی پوری دستور ساز اسمبلی ہی کو گھر بھیج دیا ہے تو یہ عین انصاف اور عین قانون ہے۔ چوں کہ وہ ملکہ الزبتھ کے نمائندے ہیں اس لیے یہ فیصلہ ملکہ کا فیصلہ سمجھا جائے گا

اور ملکہ معظمہ کے فیصلے کے سامنے دستور ساز اسمبلی کی کیا مجال کہ دم مار سکے۔(یاد رہے یہ 1955ء کا قصہ ہے۔پاکستان کے قیام کے 9 سال بعد کا)۔

معلوم نہیں یہ محض اتفاق ہے یا حسن انتظام کہ قومی سیاسی اور قانونی بیانیے میں یہ بات کبھی جگہ نہیں بنا سکی کہ وہ کیا خوفناک دلیل تھی جو گورنر جنرل غلام محمد کی جانب سے عدالت میں پیش کی گئی اور عدالت نے قبول کر لی۔یاد رہے جسٹس کارنیلیس صاحب نے بطور جج فیصلے میں اپنے اختلافی نوٹ میں لکھا تھا کہ یہ پاکستان کی خود مختاری کی توہین ہے۔یہ عمل اصل میں توہین مسلسل ہے، جس کے عنوانات بدلتے رہتے ہیں، متن ایک جیسا ہی رہتا ہے۔

آیئے اس معاملے کو اس کے پورے سیاق وسباق میں دیکھتے ہیں تا کہ ہمیں معلوم ہو سکے نوآبادیاتی دور کے احساس کمتری نے کیسے ہمارے اجتماعی سفر کو آغاز میں ہی غلط سمت میں ڈال دیا اور ہم آج تک اس کے آسیب سے نکل نہیں پائے۔

قیام پاکستان کے وقت پاکستان کی ایک اپنی دستور ساز اسمبلی تشکیل پائی۔یہ ان اراکین پر مشتمل تھی جنھوں نے 1945ء کے مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی۔برطانوی نوآبادیاتی ہندوستان میں یہ الیکشن بہت اہم تھے۔کانگریس یہ الیکشن جیت گئی تھی مگر مسلمانوں کی تمام نشستوں پر مسلم لیگ نے کامیابی حاصل کی تھی۔یوں گویا مسلم لیگ نے یہ بات ثابت کر دی کہ مسلمانوں کی نمائندگی صرف مسلم لیگ کر رہی ہے۔اسی کامیابی نے قیام پاکستان کی راہ ہموار کرتے ہوئے متحدہ ہندوستان کے تصور کی عملی نفی بھی کر دی۔

جب برطانیہ یہاں سے رخصت ہونے لگا تو طے یہ ہوا کہ جو علاقے پاکستان کا حصہ بننے جا رہے ہیں، وہاں سے جو لوگ 1945ء کے مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں کامیاب ہوئے تھے وہی لوگ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے رکن ہوں گے۔یہ بھی طے ہوا کہ یہ

دستور ساز اسمبلی پاکستان کے لیے پہلا آئین بنائے گی۔جب تک یہ اسمبلی اپنا آئین نہیں بناتی تب تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935ء پاکستان کا عارضی آئین قرار پایا۔

پاکستان کی اس دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس 10 اگست 1947ء کو ہوا۔اس وقت سپیکر کے بجائے صدر کا عہدہ ہوا کرتا تھا تو قائداعظم اس دستور ساز اسمبلی کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔یہ ان لوگوں پر مشتمل اسمبلی تھی جو 1945ء کے مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں مسلمان نشستوں پر منتخب ہوئے اور یہ لوگ قائداعظم کا اپنا انتخاب تھے۔اسی اسمبلی میں قائداعظم نے 11 اگست کو خطاب کیا اور ریاست کے فکری خدوخال واضح کیے۔بعد میں اسی اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کی اور ریاست کی فکری ساخت کو واضح کیا کہ حاکمیت اعلیٰ خدا کی ہو گی۔

قائداعظم جلد بیمار ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بنے مگر مستعفی ہو گئے۔غلام محمد اب نئے گورنر جنرل تھے۔اسمبلی کے نئے صدر (سپیکر) مولوی تمیز الدین منتخب ہوئے۔پھر لیاقت علی خان کو راولپنڈی میں گولی مار دی گئی۔تحقیقات کرنے والا تحقیقات سمیت جہاز میں مر گیا، اور گورنر جنرل کو جانے والی فائل جب واپس آئی تو اندر سے خالی تھی۔محلاتی سازشوں کے باوجود آئین سازی پر کام جاری رہا۔نئے گورنر غلام محمد نے پہلے تو وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا اور پھر عین اس وقت جب قائداعظم کی دستور ساز اسمبلی پاکستان کا پہلا آئین ڈرافٹ کر کے پیش کرنے والی تھی، گورنر جنرل غلام محمد نے اسمبلی ہی توڑ دی۔

قائداعظم کی آئین ساز اسمبلی جسے قائداعظم نے آئین بنانے کا حکم دیا تھا، آئین تیار کر چکی تھی۔جیسے ہی آئین نافذ ہوتا، ملکہ برطانیہ کے نمائندے کے طور پر کام کرنے والے گورنر جنرل کا عہدہ اور اختیارات ختم ہو جانے تھے اور وہ عارضی بندوبست لپیٹ دیا جاتا جو گورنمنٹ آف

انڈیا ایکٹ، 1935ء کی صورت میں نافذ تھا۔ اسمبلی نے یہ طے کیا کہ پہلا آئین اسمبلی میں اس دن پیش کیا جائے گا جس دن بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کی سالگرہ منائی جا رہی ہو گی، یعنی 25 دسمبر کو۔ گورنر جنرل نے اس سے پہلے ہی اسمبلی توڑ دی۔

مولوی تمیز الدین اس فیصلے خلاف سندھ ہائی کورٹ چلے گئے۔ سندھ ہائی کورٹ نے مولوی تمیز الدین کے حق میں فیصلہ کر دیا۔[1] اس پر حکومت فیڈرل کورٹ (سپریم کورٹ) میں چلی گئی، جہاں جسٹس منیر نے سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے گورنر جنرل کے حق فیصلہ دے دیا۔[2] یہاں گورنر جنرل کی قانونی ٹیم نے جو دلائل دیے، ان کی نوعیت یہ تھی کہ فیصلے سے اختلافی نوٹ میں جسٹس کارنیلیس نے لکھا کہ یہ پاکستان کی خود مختاری کی توہین ہے۔

مولوی تمیز الدین کے وکیل ڈی ایم پرٹ تھے اور گورنر جنرل کی وکالت سر آئیور جیننگز کر رہے تھے۔ گورنر جنرل نے اپنے وکیل کو جو فیس دی تھی وہ اس وقت پاکستان کے چیف جسٹس کی تنخواہ سے سات گنا زیادہ تھی۔[3] دوسری جانب یہ حالت تھی کہ معاملہ جب سندھ ہائی کورٹ کے بعد فیڈرل کورٹ میں پہنچا تو مولوی تمیز الدین صاحب کے پاس فیڈرل کورٹ میں وکیل کو دینے کو فیس نہیں تھی اور ان کی وکالت آئی آئی چندریگر نے کی۔ ان کے وکیل ڈی ایم پرٹ نے اگرچہ یہ پیش کش کی کہ وہ مفادِ عامہ کے اس مقدمے میں بغیر فیس کے بھی پیش ہونے کو

[1] PLD 1955, Sindh 96.

[2] PLD 1955, FC, 240.

[3] ایلن میک گرا، *The Destruction of Pakistan's Democracy* (کراچی: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، 1996ء)، 160۔

تیار ہیں۔[4]

اس مقدمے میں جو دلائل دیے گئے اور جو فیصلہ دیا گیا، ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی نوآبادیاتی دور کا احساس کمتری کتنا شدید تھا۔

گورنر جنرل کی جانب سے عدالت جو موقف پیش کیا گیا اس کے اہم نکات یہ ہیں:

1. پاکستان چوں کہ ابھی تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935ء کے تحت چل رہا ہے اس لیے یہ ایک آزاد ملک نہیں ہے۔ یہ ایک مقبوضہ اور محکوم ریاست (Dominion) ہے جس پر حاکمیت 'کراؤن' (ملکہ) کی ہے۔
2. پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اور اس کے قانون کی کوئی حیثیت نہیں اختیارات اور اقتدار کا مالک 'کراؤن' ہے۔
3. پاکستان میں گورنر جنرل چوں کہ ملکہ کا نمائندہ ہے اس لیے پارلیمان کے ہر قانون کے لیے اس سے توثیق حاصل کرنا ضروری ہے۔
4. پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے کسی قانون کسی ایکٹ کی اس وقت تک کوئی حیثیت نہیں جب تک ملکہ کے نمائندہ کے طور پر گورنر جنرل اس کی توثیق نہ کر دے۔
5. چوں کہ بادشاہت ملکہ کی ہے، حکم ملکہ کا ہے، اختیار ملکہ کے پاس ہے اس لیے اس کا نمائندہ اگر اسمبلی کو گھر بھیج دیتا ہے تو اس نمائندے کے حکم کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ نمائندے کا حکم ملکہ کا حکم ہوتا ہے اور ملکہ کے حکم سے سرتابی کی اجازت نہیں ہے۔

[4] ایضاً، 175۔

6. عدالت اس معاملے میں رٹ جاری نہیں کر سکتی کیونکہ رٹ کا اختیار صرف 'کراؤن' (بادشاہ یا ملکہ) کے پاس ہے اور ان کے نمائندوں کے خلاف رٹ جاری کرنے کا عدالت کے پاس اختیار نہیں۔
7. اگر بادشاہ کے نام پر کوئی اہلکار کسی منصب پر قابض ہو جاتا ہے تو یہ اختیار صرف بادشاہ کو ہے کہ وہ اسے غاصب قرار دے، عدالت کو نہیں۔
8. اور اگر ایسا شخص بادشاہ کا اپنا منتخب کردہ ہو اور اس کا نمائندہ ہو تو بادشاہ کی ماتحت عدالت بادشاہ کے نمائندے کے خلاف کیسے رٹ جاری کر سکتی ہے؟
9. یہ رٹ جس قانون کے تحت دائر کی گئی ہے اس دفعہ 223اے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں کیونکہ اسے دستور ساز اسمبلی نے قانون بنایا ہے لیکن گورنر جنرل نے بطور قانون اس کی توثیق نہیں کی۔

سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جارج بیگزینڈل کانسٹنٹین نے گورنر جنرل کی جانب سے پیش کیے گئے موقف کو دلیل کے ساتھ رد کر دیا اور مولوی تمیز الدین کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ عدالت نے تفصیل کے ساتھ ایک ایک نکتے پر بحث کی اور قرار دیا کہ گورنر جنرل کے اقدامات غلط ہیں۔ عدالت نے کہا کہ پاکستان ایک آزاد ملک ہے۔ یہ اب محکوم یا کسی کا مقبوضہ ملک نہیں۔ عدالت نے کہا کہ انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947ء میں صاف لکھا ہے کہ پاکستان ایک آزاد ملک ہے۔ عدالت نے قرار دیا کہ گورنر جنرل کے غلط اقدام پر گرفت کی جا سکتی ہے اور وہ قانون یا عدالت سے بالاتر نہیں ہے۔ عدالت نے فیصلے میں یہ بھی لکھا کہ جن دفعات کی گورنر جنرل کی قانونی ٹیم بات کر رہی ہے وہ عملاً متروک ہو چکی ہیں۔ عدالت نے کہا کہ پاکستان کے

معاملات میں اب پاکستان کی اسمبلی ہی فیصلہ ساز ہے۔ اسمبلی کو گورنر جنرل نہیں توڑ سکتا۔ اسمبلی اب صرف اس صورت میں تحلیل ہو سکتی ہے کہ وہ خود دو تہائی اکثریت سے اس کا فیصلہ کر دے۔

گورنر جنرل کے فکری مغالطوں کو دور کرتے ہوئے عدالت نے قائداعظم کی سیاسی جدوجہد کو پورے سیاق و سباق کے ساتھ قانونی پیرائے میں بیان کرتے ہوئے فیصلے میں لکھا کہ پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے۔ عدالت نے برطانوی قوانین اور برطانوی وزیراعظم کی تقاریر کے حوالے بھی دیے کہ پاکستان کی حیثیت اب آزاد ملک کی ہے اور اس کی اسمبلی بادشاہ کے نمائندے، گورنر جنرل، سے کم تر نہیں ہے اور اسمبلی جب کوئی قانون بنا دے تو گورنر جنرل کی توثیق کی کوئی ضرورت نہیں۔ پاکستان کی اسمبلی نے جو قانون بنا دیا، وہی قانون ہے۔

عدالت نے انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947ء کی دفعہ 8 کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی اسمبلی کو قانون بنانے کا مکمل اختیار ہو گا۔ عدالت نے وضاحت سے بتایا کہ قیام پاکستان کے بعد قانونی طور پر برطانوی پارلیمان پاکستان کے بارے میں کوئی قانون بنانے کا اختیار نہیں رکھتی۔ پاکستان میں فیصلہ سازی کا اختیار اب پاکستان کے پاس ہے اور برطانوی بادشاہ یا ملکہ کا اب یہاں کوئی اختیار باقی نہیں۔ عدالت نے لکھا کہ انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947ء میں 'انڈی پنڈنٹ ڈومینین' کی بات کی گئی ہے، صرف 'ڈومینین' کی نہیں اور 'ڈومینین' کے ساتھ 'انڈی پنڈنٹ' کا لفظ یہاں فالتو یا متروک اور بے معنی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں جہان معنی پوشیدہ ہے۔

عدالت نے یہ بھی واضح کیا کہ عملاً گورنر جنرل کا انتخاب بھی ہمارا ہی تھا اور ہم نے ماؤنٹ بیٹن کے بجائے قائداعظم کو گورنر جنرل بنایا۔ عدالت نے یہ بھی لکھا کہ انڈین انڈی

پنڈنس ایکٹ، 1947ء کے تحت بھلے پاکستان اور بھارت 15 اگست کو معرض وجود میں آئے لیکن پاکستان نے 14 اگست کو یوم آزادی منانے کا فیصلہ کیا کیونکہ 14 اگست کو اقتدار پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کو سونپ دیا گیا تھا۔ عدالت نے لکھا کہ اس کی معنویت ہے اور اس اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

عدالت نے انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947ء کی شان نزول پر بھی تفصیل سے بات کی اور بتایا کہ متحدہ ہندوستان میں ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں جب اسمبلی وجود میں آئی تو 6 دسمبر 1946ء کو اس کا اجلاس بلایا گیا۔ قائد اعظم نے اس اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا۔ قائد اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ مسلمانوں کی ساری نشستیں جیت چکی تھی۔ چنانچہ دباؤ بڑھا اور اس دباؤ کے نتیجے میں برطانیہ نے مسلمانوں کے لیے الگ ملک کا مطالبہ قبول کیا۔ عدالت نے لکھا کہ جب یہ مطالبہ منظور ہوا تب انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947ء آیا۔ اس لیے اس ایکٹ کو اس سیاسی منظر نامے کے سیاق و سباق میں دیکھنا ہو گا۔ عدالت کا کہنا تھا کہ یہ بات بے بنیاد ہے کہ پاکستان آزاد ملک نہیں اور فیصلوں کے لیے کسی بادشاہ، ملکہ یا ان کے نمائندے (گورنر جنرل) کا محتاج ہے۔ عدالت نے استفسار کیا کہ جب انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947ء آیا ہی قائد اعظم کے مطالبے پر پاکستان کے قیام کی جزئیات طے کرنے کو تھا اور اس میں پاکستان کے لیے 'انڈی پنڈنٹ' کے الفاظ استعمال ہوئے تو اب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی آزادی کو محدود کیسے کیا جا سکتا ہے؟

چیف جسٹس کانسٹنٹین نے لکھا کہ اب تک قانون کے کسی افسر نے یہ اعترض نہیں کیا تھا کہ دستور ساز اسمبلی کے بنائے قوانین کی بادشاہ کے نمائندے گورنر جنرل سے توثیق لازمی

ہے۔ یہ اعتراض اب کیا گیا ہے اور یہ ایک نیا اعتراض ہے اور اگر اس اعتراض کو تسلیم کر لیا جائے تو روایت اور فہم کے تسلسل کو متاثر کر دے گا جسے خود قائد اعظم کے عمل سے نسبت ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ جسٹس کانسٹنٹین کی روایت اور فہم سے کیا مراد تھی؟ روایت یہ تھی کہ اسمبلی کا پاس کردہ قانون، قانون سمجھا جاتا تھا اور خود قائد اعظم کے دور میں یہی معمول تھا۔ یہ قائد اعظم کی قائم کردہ روایت تھی کہ اسمبلی نے جو قانون بنا دیا، وہ گورنر جنرل کی منظوری کا محتاج نہیں ہے۔ وہ آزاد ملک کی پارلیمان کا بنا ہوا قانون ہے۔ فہم بھی یہی تھا کہ ایک ناگزیر ضرورت کے تحت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935ء کو ہم نے عبوری آئین ضرور بنایا ہے لیکن ہم نے اپنی پارلیمان کے حق قانون سازی پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ جیسے ہی ہم اپنا آئین بنائیں گے یہ عبوری آئین لپیٹ دیا جائے گا اور اس دورانیے میں آئین ساز اسمبلی قانون سازی کی مجاز ہو گی۔

سندھ ہائی کورٹ کا یہ فیصلہ حکومت نے سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ حیران کن طور پر سپریم کورٹ نے جسٹس منیر کی سربراہی میں گورنر جنرل کے موقف کو تسلیم کر لیا اور سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا۔ یہ ہماری تاریخ کا نہایت ہی تکلیف دہ باب ہے۔ یہ انتہائی تباہ کن فیصلہ اور بابائے قوم کی فکر سے صریح انحراف تھا۔ یہ فیصلہ نہ صرف آئینی اور پارلیمانی روایت کے لیے تباہ کن تھا بلکہ اس نے سماج کے فکری اور نفسیاتی توازن کو بھی ادھیڑ کر رکھ دیا۔ تصور کیجیے کہ ملک کے قیام کے 9 سال بعد ملک کی سب سے بڑی عدالت اس موقف کو تسلیم کر رہی ہے کہ پاکستان مکمل آزاد اور خود مختار ملک نہیں ہے اور برطانوی 'کراؤن' (بادشاہ یا ملکہ) کے نمائندے (گورنر جنرل) کے آگے اس پوری پارلیمان کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ اسمبلی سالوں کی

مشاورت کے بعد کوئی قانون بنائے تو بادشاہ کے نمائندے کو حق حاصل ہے وہ اس قانون کو اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دے۔

جسٹس منیر نے فیصلے میں لکھا کہ ہائی کورٹ کو اس معاملے میں رٹ جاری کرنے کا اختیار نہیں تھا اور پارلیمان کی جانب سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں متعارف کردہ دفعہ 223 اے کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ عزت مآب گورنر جنرل، نمائندہ ملکہ برطانیہ نے پاکستانی اسمبلی کے بنائے گئے اس قانون کی توثیق نہیں کی۔ عدالت نے کہا کہ یہ توثیق لازم تھی، اس کے بغیر کوئی قانون نہیں بن سکتا تھا اور توثیق کی اس لازمی شرط کا خاتمہ کرنا دستور ساز اسمبلی کے اختیار میں نہیں تھا۔ بادشاہت کی اس توثیق کے خاتمے کا اختیار بھی صرف بادشاہ سلامت یا ملکہ معظمہ کے پاس ہے۔ یہ صرف ایک شاہی اختیار ہے کسی پارلیمان کو اس کا اختیار نہیں ہے اور ایسا کوئی واقعہ یا ثبوت موجود نہیں کہ بادشاہت کی جانب سے اس اختیار کو ختم کیا ہو۔

عدالت نے مزید وضاحت کی کہ یہ بادشاہت یا اس کے نمائندے کا بہت قدیم حق ہے یہ کوئی نیا حق نہیں ہے۔ اس لیے گورنر جنرل کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی بھی قانون کی توثیق سے انکار کردے۔ وہ بادشاہت کا نمائندہ ہے اور وہ بااختیار ہے۔

عدالت نے قرار دیا کہ برطانیہ میں اس وقت تک کوئی قانون، قانون نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک 'کراؤن' بادشاہ سلامت یا ملکہ اس کی توثیق نہ کردیں اور ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ برطانیہ میں اس روایت سے ہٹ کر کوئی کام کیا گیا ہو۔ (یعنی عدالت کے نزدیک انڈی پنڈنس ایکٹ کے آجانے کے باوجود اور ایک آزاد ریاست کی تشکیل کے بعد بھی، پاکستان کی پارلیمان اسی طرح بادشاہ سلامت اور ملکہ عالیہ کے 'ماتحت' تھی جیسے برطانیہ کی اور برطانیہ کی روایات کو آج بھی فیصلہ کن درجہ حاصل تھا)۔

چنانچہ چیف جسٹس، جسٹس منیر نے لکھا کہ اگر کوئی یہ سمجھتا کہ پاکستان کی یہ دستور ساز اسمبلی ریاست کی "Sovereign Body" ہے تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ میں اس معاملے میں بہت واضح ہوں کہ ہمارا اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں نہ ہمیں اس کی کوئی پرواہ ہے کہ اس فیصلے کے نتائج کیا ہوں گے اور وہ کتنے تباہ کن یا فائدہ مند ہوں گے، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ برطانوی بادشاہت کی توثیق کے بغیر یہاں کوئی قانون نہیں بن سکتا۔

اس فیصلے میں صرف ایک اختلافی نوٹ تھا اور وہ جسٹس کارنیلیس کا تھا۔ ان کا کہنا تھا پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے اور اس کے فیصلے کرنے کا اختیار اس کی اسمبلی کے پاس ہے۔ جسٹس کارنیلیس نے یہ بھی لکھا کہ اب وہ گورنر جنرل ہو یا خود بادشاہ ہو کوئی بھی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا حصہ نہیں اور اب کوئی بادشاہ ہو یا اس کا نمائندہ، پاکستان کی پارلیمان سے وہ بالاتر نہیں ہے۔ پاکستان کے فیصلوں کی مجاز صرف پاکستان کی اسمبلی ہے اور اس کے فیصلے ہی پاکستان کا قانون ہیں اور ان فیصلوں کی بادشاہ یا اس کے نمائندے سے توثیق کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947ء کی سیکشن 6 کی ذیلی دفعہ 2 میں کہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو پاکستان کی اسمبلی کے بنائے گئے قانون کی بادشاہت یا اس کے نمائندے سے توثیق کو لازمی قرار دیتی ہو۔ جسٹس کارنیلیس نے اس نوٹ میں لکھا کہ پاکستان کی پارلیمان مکمل طور پر خود مختار ہے اور فیصلہ سازی کی پوری قوت رکھتی ہے۔ وہ اب کسی بادشاہ یا ملکہ کی توثیق کی محتاج نہیں اور اس پر کوئی ایسی پابندی لگانا اس کے اختیارات غصب کرنے کے مترادف ہوگا۔

جسٹس کارنیلیس نے اپنے اختلافی نوٹ میں یہاں تک لکھا کہ بطور جج میں صرف آئین پاکستان کے تابع ہوں، کسی ملکہ کا نہیں۔ انھوں نے لکھا کہ انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947ء کا ایک سیاق وسباق ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں نے برطانیہ کے خلاف 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک چلائی۔ یہ تحریک بتا رہی ہے کہ عوام کیا چاہتے تھے۔ انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ اسی خواہش کا عملی اظہار تھا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ پاکستان کو ایک خود مختار اور آزاد ریاست تسلیم نہ کیا جائے۔

جسٹس کارنیلیس نے کہا پاکستان نے جب یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ ایک اسلامی جمہوریہ ہے تو کیا اس کے لیے کسی بادشاہ یا ملکہ سے توثیق کرائی گئی تھی؟ یہ پاکستان کا فیصلہ تھا اور ایک خود مختار ملک کے طور پر وہ اپنے فیصلے کرنے کا مجاز تھا۔

جسٹس کارنیلیس نے اپنے فیصلے میں قائدِ اعظم کے اس حلف کا بھی ذکر کیا جو انھوں نے بطور گورنر جنرل لیا تھا۔ کارنیلیس لکھتے ہیں کہ جب قائدِ اعظم کے سامنے True faith and allegiance to His Majesty کے الفاظ آئے تو انھوں نے یہ حلف اٹھانے سے انکار کر دیا کہ allegiance بادشاہ سے نہیں پاکستان کے آئین سے ہوگی۔ چنانچہ allegiance کے ساتھ His Majesty کا لفظ کاٹ کر آئین پاکستان کر دیا گیا۔ جسٹس کارنیلیس نے سوال کیا کہ جب پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ہی بادشاہ کے بجائے آئین کے تابع تھے تو بعد میں کوئی اور اس اصول سے انحراف کیسے کر سکتا ہے۔

جسٹس کارنیلیس نے یہاں تک لکھا کہ اگر گورنر جنرل ملکہ کے نمائندے کے طور پر پاکستان کی اسمبلی کے بنائے قانون کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور اس اسمبلی ہی کو تحلیل کر دیتے ہیں تو یہ

ہمارے ملک کے داخلی امور میں مداخلت سمجھی جائے گی جو بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔

جسٹس کارنیلیس قوم کے جذبات اور قائدِ اعظم کی فکر کی ترجمانی کر رہے تھے لیکن ان کی رائے عدالت کا فیصلہ نہ تھا، یہ محض ایک اختلافی نوٹ تھا۔ اس میں کیا شک ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے شاندار فیصلے اختلافی نوٹ میں لکھے گئے ہیں۔

ایلن مک گرا نے لکھا کہ اس فیصلے نے پاکستان کو مکمل افراتفری سے دوچار کر دیا۔[5]

جسٹس منیر تو اپنے تئیں 'نتائج سے بے نیاز ہو کر' فیصلہ لکھ رہے تھے لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس فیصلے نے پاکستان کو اس دلدل میں دھکیل دیا جس کے آزار سے پاکستان آج تک نہیں نکل سکا۔ اس ایک فیصلے سے انھوں نے اسمبلی کی سات سالہ قانون سازی کو ضائع کر دیا۔ 45 عدد ایکٹ کالعدم قرار پائے۔ ملک آئینی طور پر افراتفری سے دوچار کر دیا گیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد جب جسٹس منیر نے کتاب لکھی تو اس میں 'نتائج سے بے نیاز' ہو کر لکھے گئے اس فیصلے کا جواز یہ دیا کہ اگر میں کچھ اور فیصلہ کرتا تو وہ حکومت نے تسلیم ہی نہیں کرنا تھا۔

اس عذرِ گناہ سے متصل یہ سوال نہایت اہم ہے کہ عدالت کا بنیادی کام انصاف کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا ہے یا اسے وہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے جو طاقتور فریق کو بھی قبول ہو۔ نوآبادیاتی دور کے احساسِ کمتری اور غلامی کے تصورات میں لپٹے اس فیصلے اور اس نامعتبر دلیل نے پاکستان کی آئینی جورسپروڈنس کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اس کے نتائج ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

لیکن اس کے اثرات صرف قانونی نہ تھے۔ اس نے قومی اجتماعی فکری شناخت کو بھی

---

[5] ایضاً، 186۔

آلودہ کر دیا۔ کسی آزاد ملک کو آزادی کے 9 سال بعد اس کی سب سے بڑی عدالت یہ بتا رہی ہو کہ تم ابھی آزاد نہیں ہوا اور تمہاری پارلیمان کے بنائے قانون کو ملکہ معظمہ کا نمائندہ اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کا استحقاق رکھتا ہے اور چوں کہ وہ ملکہ معظمہ کا نمائندہ ہے اس لیے اس کی بات کو پارلیمان پر ترجیح دی جائے گی اور تم اگر اپنی پارلیمان کو خود مختار (Sovereign) سمجھتے ہو تو تم احمقوں کی جنت میں رہتے ہو اور تمہارے کسی اجتماعی فیصلے کی ملکہ کے نمائندے کی خواہشات کے آگے کوئی حیثیت نہیں تو کیا اس سے معاشرے کی نفسیات پر کوئی اثرات مرتب نہیں ہوں گے؟ جسٹس کارنیلیس نے شاید اسی لیے اس فیصلے کو 'پاکستان کی آزادی کی توہین' قرار دیا۔[6]

دل چسپ بات یہ ہے کہ اس پوری ساعت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی نوآبادیاتی روایات، برطانیہ کے قوانین، برطانیہ کی روایات اور برطانیہ کی پارلیمانی تاریخ میں شاہ معظم اور ملکہ معظمہ کے اختیارات پر تو بحث ہوتی رہی لیکن کسی نے یہ نکتہ نہیں اٹھایا کہ اسلام اور قرآن ایسے مواقع پر کیا رہنمائی فرماتے ہیں۔ کسی نے وامرھم شوری بینھم کی شرح بیان نہیں کی۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ اسلامی روایات کیا ہیں۔ برطانوی نوآبادیاتی بندوبست کے لاشعوری اور نفسیاتی اثرات دیکھیے کہ نظم اجتماعی کا اتنا بڑا مسئلہ اور دلائل میں صرف برطانوی قانون، برطانوی روایات، شاہ معظم اور ملکہ عالیہ سے جڑی روایات کو 'معیار حق' سمجھ کر پیش کیا جاتا رہا۔ کسی کو یہ توفیق بھی نہ ہو سکی کہ وہ اس 'قرارداد مقاصد' ہی کا حوالہ دے دیتا جو 12 مارچ 1949ء کو اسمبلی نے منظور کی تھی۔ یہ قرارداد ایک اہم دستاویز تھی، یہ گویا نئی ریاست کا چارٹر تھا اور عوامی نمائندے بتا رہے تھے کہ ریاست کی فکری ساخت کیا ہوگی۔ ملک کو درپیش پہلے بڑے آئینی اور پارلیمانی بحران میں

[6] ایضاً، 185۔

اس چارٹر کا کہیں تذکرہ نہیں۔ عدالتی نظیر کی تلاش میں قدیم برطانوی شاہی درباروں کی روایات تک کو چھاننے والوں نے اس پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیا کہ ایسے معاملات میں یہ قرارداد کیا رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ شعوری غلامی کی اس سے بدتر شکل اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جسٹس کارنیلیس اور جسٹس کانسٹنٹین (چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ) جیسے غیر مسلم جج تو پاکستان کو ایک آزاد ملک قرار دے رہے ہیں اور ان کا فیصلہ یہ ہے کہ پاکستان کی پارلیمان خود مختار ہے اور اس کے قوانین کسی بادشاہ اور ملکہ یا ان کے نمائندے سے توثیق کے محتاج نہیں لیکن مسلمان جج، جسٹس منیر یہ کہہ رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہے اور جو ایسا سمجھتا ہے کہ پاکستان کی پارلیمان فیصلہ سازی میں آزاد ہے اور اس کے بنائے گئے قانون کو ملکہ کے نمائندے کی توثیق کی ضرورت نہیں، وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ اتفاق دیکھیے کہ بنچ میں موجود دیگر سارے مسلمان جج بھی جسٹس منیر کے ہم خیال تھے اور اختلاف کرنے والے واحد جج جسٹس کارنیلیس تھے۔ یہ حریت فکر جو غیر مسلم ججوں میں موجود تھی، مسلمان ججوں میں کیوں نہ آسکی؟ یہ سوال سماجیات اور نفسیات کا ایک اہم موضوع ہے۔

برطانوی بادشاہت کے نمائندے کی حیثیت بھی کیا تھی؟ جسٹس کارنیلیس کے الفاظ مستعار لیں تو محض اتنی کہ رسمی طور پر ان کے منصب کی منظوری برطانوی بادشاہت کی طرف سے ہوئی تھی ورنہ ان کا انتخاب ہی برطانیہ یا ملکہ نے نہیں، پاکستان کی پارلیمان نے کیا تھا۔ عبوری آئین کے تحت ایک رسم تھی جو بادشاہ نے پوری کی ورنہ موصوف پورے دور میں امور منصب کے لیے ایک بار بھی ملکہ سے نہ مل سکے۔ لیکن طنطنہ دیکھیے کہ محض ایک رسمی پروانے کی بنیاد پر وہ خود کو ایک آزاد ملک میں بھی آقا سمجھ رہے تھے اور کس دیدہ دلیری سے ان کی جانب سے عدالت میں یہ

موقف اختیار کیا گیا کہ پاکستان تو ایک آزاد ملک نہیں ہے اور ملکہ کے نمائندے کی حیثیت سے میں قائدِ اعظم کی اس اسمبلی سے بالاتر ہوں۔ جب چاہوں اسے گھر بھیج دوں۔

نوآبادیاتی دور کی فکری گرہیں اتنی شدید تھیں کہ ہمارے گورنر جنرل صاحب قیامِ پاکستان کے کئی سال بعد بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ پاکستانی پارلیمان کی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں اور چوں کہ وہ ملکہ کے نمائندے ہیں تو محکوموں کی پارلیمان کی کیا جرات کہ وہ ان کے آگے دم مار سکے۔

ملکہ الزبتھ کا اپنا موقف بالکل اور تھا۔ یہ وہی موقف تھا جو قائدِ اعظم اور جسٹس کارنیلیس اور جسٹس کانسٹنٹین کا موقف تھا۔ چوں کہ پاکستان ایک آئینی جدوجہد سے بنا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ جب تک پاکستان کی پارلیمان اپنا آئین نہیں بنا لیتی تب تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 1935ء ہی کو عارضی آئین سمجھتے ہوئے معاملات چلائے جائیں گے تو رسمی طور پر پہلے جارج ششم اور ان کے انتقال کے بعد ملکہ الزبتھ پاکستان کی آئینی سربراہ قرار پائیں۔ یاد رہے کہ قائدِ اعظم نے حلف کی عبارت میں بادشاہ کے تابع ہونے والا فقرہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس میں تبدیلی کروائی تھی۔ چنانچہ اس رسمی تقاضے کو سمجھتے ہوئے اپنی رسمِ تاج پوشی کے موقع پر ملکہ الزبتھ نے کہا تھا کہ پاکستان کے معاملات پاکستان کے قانون اور روایات کے مطابق چلائے جائیں گے۔ انھوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ برطانوی قانون یا برطانوی روایات کے مطابق چلائے جائیں گے۔

پاکستان کی روایات کیا تھیں؟ یہی کہ اسمبلی کے بنائے قانون کو گورنر جنرل یا ملکہ کی توثیق کی ضرورت نہیں۔ اتنا کافی ہے کہ پاکستان کی پارلیمان کوئی قانون منظور کر لے۔ اور یہ

روایت خود قائدِ اعظم نے قائم کی تھی۔ گورنر جنرل غلام محمد اور جسٹس منیر نے یہ سب روایات پامال کر دیں۔ چنانچہ جب گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو منصب سے الگ کر دیا تو خواجہ صاحب نے ملکہ سے مداخلت کی درخواست کی۔ لیکن 'مداخلت' سے انکار کر دیا گیا۔[7] خواجہ صاحب کو برطانوی ہائی کمیشن کی عمارت میں خوش آمدید کہتے ہوئے بتایا گیا کہ یہ آپ کا مسئلہ ہے، ملکہ اس میں مداخلت نہیں کریں گی۔ یہ بھی وضاحت کی گئی کہ برطانوی ہائی کمشنر پاکستان میں ملکہ برطانیہ کی نمائندگی کر رہے ہیں، ملکہ پاکستان کی نہیں۔ یعنی ملکہ کے نزدیک ایسا کرنا پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت ہوتی۔ یہ بعینہ وہی نکتہ تھا جو جسٹس کارنیلیس اپنے اختلافی نوٹ میں لکھ رہے تھے۔

یہ معاملہ محض قانونی نہیں تھا، یہ سماجی اور فکری معاملہ بھی ہے۔ ہمارے ہاں سماجی مطالعے کی کوئی رسم ہوتی تو معلوم ہوتا مسلمانوں کے اس رویے کے محرکات کیا تھے اور کیا یہ برطانوی نوآبادیات کی فکری اور نفسیاتی گرہیں تھیں جو قیامِ پاکستان کے نو سال بعد بھی کھلنے میں نہیں آ رہی تھیں اور ہم اپنے شعورِ اجتماعی کو اور اپنی پارلیمان کو پاکستان بننے کے نو سال بعد بھی ملکہ معظمہ کے ایک رسمی اور عارضی نمائندے کی خواہش پر قربان کر رہے تھے۔

اس وقت اگر سندھ ہائی کورٹ کا فیصلہ باقی رہ گیا ہوتا یا فیڈرل کورٹ نے جسٹس کارنیلیس کی رائے پر فیصلہ دیا ہوتا تو پاکستان کی آئینی اور پارلیمانی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ یہ جو بعد میں مارشل لاء لگتے رہے اور دستور پامال ہوتا رہا اور پارلیمان گھر بھیجی جاتی رہی، یہ اسی فیصلے کے منطقی

---

[7] اخلش پلالامری، "When Elizabeth II was Queen of Pakistan"، دی ڈپلومیٹ، 17 مارچ، 2016ء۔

نتائج ہیں جو برطانوی نوآبادیات کی مرعوب اور غلامانہ نفسیات کے زیر اثر کیا گیا تھا۔

نوآبادیاتی نظام قانون کے ہمراہ ایک پورا طرزِ معاشرت یہاں متعارف کرایا گیا۔اس طرزِ معاشرت کا بنیادی نکتہ وہی تھا جو لارڈ میکالے کی فکر کا اعجاز تھا۔یعنی یہ کہ یہاں کے مقامی لوگ علم و شرف سے محروم ہیں،ان کے پاس کوئی معقول طرزِ معاشرت ہے نہ نظام تعلیم و قانون اور اب یہ سفید فام تہذیب کا بنیادی فریضہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو مہذب طرزِ معاشرت سے روشناس کرائیں۔

چنانچہ ایک طبقے نے انگریز کے اسی نظام کو آخری آفاقی سچائی سمجھ کر یوں قبول کیا کہ اپنی قدار اور روایات ہی ان کے لیے اجنبی ہو کر رہ گئیں۔یہ بعینہ وہی لوگ ہیں جن کی لارڈ میکالے نے خواہش کی تھی:

“A class of persons Indian in blood and colour, but English in tastes, in opinions, in morals and in intellect.”

ایک ایسا طبقہ جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن اپنے ذوق، فکر، اصول اور اپنے فہم کے اعتبار سے انگریز ہو۔

گاہے محسوس ہوتا ہے کہ آج ہمارا نظام ایسے ہی ''انگریزوں'' کے ہاتھوں یرغمال ہے جو صرف رنگ اور خون کے اعتبار سے پاکستانی ہیں۔

اس نظام نے ہماری معاشرت پر جو اثرات چھوڑے،ان کے کچھ ایسے مظاہر پر ہم بات کر لیتے ہیں جن کا تعلق قانون کی دنیا سے ہے اور جو بغیر کسی افادیت کے ہم نے آخری آفاقی صداقت کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں۔

وکلاء کے لباس ہی کو دیکھ لیجیے۔بلکہ زیادہ بہتر ہے کہ حبس آلود دوپہر میں کسی وکیل کو دیکھ لیجیے تاکہ حق الیقین اور عین الیقین کے مراحل ایک ساتھ طے ہو جائیں۔شدید گرمی اور حبس میں اس سیاہ رنگ کے پینٹ کوٹ اور ٹائی کا کیا جواز ہے؟ یہ تو حقوق انسانی کی باقاعدہ اور سنگین خلاف ورزی ہے۔لیکن نوآبادیاتی دور کی اس میراث کو تبرک سمجھ کر یوں اپنا لیا گیا ہے کہ اب سانس آئے نہ آئے اور گرمی اور حبس سے چاہے جسم پر نقش و نگار بن جائیں لیکن لباس ہم نے وہی زیب تن کرنا ہے جو ہمیں نوآبادیاتی ورثے میں ملا ہے۔

اس لباس کی حکمت کیا ہے اور کیا وجہ ہے کہ ہمیں اس گرم خطے میں، جہاں درجہ حرارت انسان کی جان کو آجاتا ہے، اسی لباس پر اصرار ہے؟

اس لباس کی تاریخ کے حوالے سے مختلف روایات ہیں۔ایک روایت اسے کنگ ایڈورڈ سوم سے منسوب کرتی ہے کہ اس نے اپنے حضور پیش ہونے والوں کے لیے 1327ء میں یہ لباس منتخب کیا تھا۔[8] معروف مؤرخ جے ایچ بیکر کے مطابق یہ لباس سترہویں صدی میں کنگ چارلس دوم نے رائج کیا تھا۔[9] عمومی اتفاق اس بات پر پایا جاتا ہے کہ اس لباس کو ملکہ میری دوم کے سوگ سے نسبت ہے۔[10]

ملکہ میری دوم کا 28 دسمبر 1694ء میں انتقال ہوا۔یہ ایک مقبول ملکہ تھیں جو جوانی میں ہی انتقال کر گئیں۔ان کا طویل سوگ منایا گیا۔سارے جاڑے ان کی میت محفوظ پڑی رہی۔پانچ مارچ 1695ء کو ان کی تدفین ہوئی۔یہ پہلی ملکہ تھیں جن کی تدفین میں تمام اراکین پارلیمان

[8] حرش کبرا، ''Black Armour of Law''، دی ہندو، 31 مئی، 2010ء۔

[9] ایضاً۔

[10] ایضاً۔

شریک ہوئے۔ جج صاحبان بھی بطور خاص اس سوگ میں شامل ہوئے۔[11] کنگ ولیم نے تمام ججز اور وکلاء کو حکم دیا کہ وہ سوگ کی علامت کے طور پر سیاہ لباس پہنیں۔ دو ماہ بعد ملکہ کی تدفین تو ہو گئی لیکن چوں کہ کنگ ولیم نے سیاہ لباس پہننے والا یہ حکم واپس نہیں لیا اس لیے سیاہ لباس اسی طرح پہنا جاتا رہا جو بعد میں برطانیہ میں قانون کی دنیا سے ایک روایت کی صورت جڑ گیا۔

اس لباس کی نسبت سے جڑی روایات کو یکسر نظر انداز بھی کر دیں تو پاکستان کے ماحول کے سوال کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ ہمارے ملک میں درجہ حرارت بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس حدت میں جب مون سون کا حبس بھی شامل ہو جاتا ہے تو ایسے میں یہ لباس شعور انسانی ہی کی نہیں حقوق انسانی کی پامالی کے زمرے میں بھی آتا ہے۔ نو آبادیاتی بندوبست اس بات سے بے نیاز تھا کہ اس کے وکلاء کا پیرہن یہاں کے مقامی موسم کے لحاظ سے موزوں ہے یا نہیں۔ اس کے خیال میں چوں کہ اس کی تہذیب کا ہر رنگ مبارک تھا اس لیے "White Man's Burden" کے تحت غیر مہذب اقوام کو 'مہذب لباس' پہنانا بھی ضروری تھا۔ دل چسپ بات ہے کہ جنھیں یہ نا مناسب لباس پہنایا گیا ہے وہ اسی پر نازاں ہیں کہ کامن لاء کا پیرہن اوڑھ لیا ہے اور انھیں اس لطیف نکتے سے کوئی غرض نہیں کہ ان کے وجود پر کیا بیت رہی ہے۔ اس رویے کا بھی سماجی اور نفسیاتی مطالعہ ہونا چاہیے۔

ہمارے ہاں اعلیٰ عدلیہ کے جج صاحبان کو 'مائی لارڈ' اور 'لارڈ شپ' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ اس طرز تخاطب کا ہماری روایات اور ہماری قدروں سے کتنا واسطہ ہے؟ مسلمان

[11] مورین والر، *Sovereign Ladies: The Six Reigning Queens of England* (انگلینڈ: جان مرے پبلشرز، 2006ء)، 289۔

معاشروں میں جج یعنی قاضی کی قدر و منزلت غیر معمولی رہی ہے۔ گویا یہ احترام ہماری تہذیبی روایات کا حصہ ہے۔ کیا ہمارے پاس اپنے جج صاحبان کو عزت و احترام کے ساتھ مخاطب کرنے کے لیے اپنی اقدار اور روایات میں کوئی لفظ نہیں ہے؟ کیا ہمارا ذخیرہ الفاظ بانجھ ہو چکا ہے؟

جنرل ضیاء الحق کے دور میں صدارتی فرمان کے ذریعے مائی لارڈ اور لارڈ شپ کے انداز تخاطب سے منع کر دیا گیا اور اس کی جگہ جناب والا اور جناب عالی جیسے الفاظ رائج کیے گئے۔[12] لیکن بعد میں یہ حکم نامہ یہ کہہ کر منسوخ کر دیا گیا کہ چوں کہ آئین پاکستان کے آرٹیکل 191 اور آرٹیکل 202 عدالت عظمیٰ اور عدالت عالیہ کو با اختیار بناتے ہیں کہ وہ اپنے قواعد و ضوابط کو منضبط کرنے کے لیے قوانین وضع کر سکیں اس لیے صدارتی آرڈر منسوخ کیا جاتا ہے۔

اس ضمن میں ہائی کورٹ میں ملک اللہ یار خان نے ایک رٹ کی تھی جو خود بھی سپریم کورٹ کے وکیل تھے اور ان کی وکالت اے کے ڈوگر صاحب نے کی تھی۔ اس میں اسی انداز تخاطب پر سوال اٹھایا گیا تھا لیکن چوں کہ سوال مذہبی پیرائے میں تھا تو عدالت نے اس موقف کو قبول نہ کیا اور جناب جسٹس ناصر سعید شیخ نے فیصلے میں لکھا کہ یہاں لارڈ کا مطلب خدا ہرگز نہیں اور یہ لفظ عمومی احترام کے طور پر برطانوی روایات سے لیا گیا جہاں کا قانونی حلقہ بالعموم عیسائیت کا پیرو کار ہے۔ (یعنی وہ کسی جج کو خدا کیسے کہہ سکتا ہے)۔

اس انداز تخاطب پر سوال مگر مذہبی نہیں، سماجی بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ عمومی احترام کے طور پر اپنے منصف کو مخاطب کرنے کے لیے ہم برطانوی روایات کے محتاج کیوں ہیں؟ آزادی کے بعد ہم اپنے جج صاحبان کو اپنی روایات کے مطابق مخاطب کیوں نہیں کرتے؟ ہمیں آخر قدیم

[12] صدارتی فرمان نمبر 15، 1980ء۔

برطانوی جاگیردار معاشرت کا انداز تخاطب کیوں اختیار کرنا پڑا ہے؟ کیا ہمارے پاس اپنے قابل احترام لوگوں کو مخاطب کرنے کے لیے اپنی اقدار سے ہم آہنگ کوئی لفظ نہیں؟

برطانوی نوآبادیاتی بندوبست کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ریاست کا معاملہ شہریوں سے نہیں رعیت سے ہے۔ یعنی یہ عوام اور ان کے منتخب حکمرانوں کا تعلق نہیں تھا۔ یہ رعایا اور اس کے آقا کا تعلق تھا۔ عمومی نصاب کی کتب سے لے کر قانون کی کتب تک یہی اہتمام موجود رہا۔ چنانچہ اصول یہ تھا کہ رعایا میں سے جو فرماں بردار ہیں، بادشاہ کا قانون ان فرماں بردار غلاموں کی دادرسی کرے گا اور جو گستاخ ہیں، ان سے نبٹے گا۔ اس فرماں بردار رعیت کو پھر کچھ آداب سکھائے گئے کہ غلام رعایا جب برطانوی آقا کی بنائی گئی کسی عدالت میں آقا کے قانون کے تحت انصاف کی التجا لے کر حاضر ہوگی تو اسے کون سے آداب بجالانے ہوں گے۔

رعایا کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ انصاف 'طلب' کرتی۔ رعایا کو 'ڈیمانڈ' کی گستاخی کی اجازت نہیں تھی، اسے صرف رعیت اور غلامی کے آداب سکھائے گئے۔ جیسے نوکر اپنے مالک کے حضور التجا لے کر حاضر ہوتا ہے۔

چنانچہ آج بھی کچہریوں سے وہ انداز غلامی ختم نہیں ہو سکے۔ انصاف مانگنے والے کو آج بھی 'سائل' لکھا جاتا ہے۔ اور یہ 'سائل' آج بھی 'عرض گذار' اور 'ملتمس' ہی پایا جاتا ہے۔ صدیوں کا 'عجز' سماج کی رگوں میں یوں دوڑتا پھر رہا ہے کہ وہ انصاف کے حصول کے لیے بھی جاتا ہے تو ایسے انداز سے التجا کرتا پایا جاتا ہے جو اسلامی اقدار اور شرف انسانی سے فروتر ہے۔ قابل غور نکتہ یہ ہے کہ حقوق انسانی کے اس دور میں بھی ہمارے ہاں انصاف طلب نہیں کیا جاتا۔ اس کے لیے Prayer کی جاتی ہے۔ باقاعدہ اہتمام سے پوچھا اور بتایا جاتا ہے کہ Prayer کیا ہے۔

یہی رویہ جب سماج میں ظہور کرتا ہے تو بچوں کی سکول سے چھٹی کی درخواست "I beg to say" سے شروع ہوتی ہے۔ سائل بے چارہ اسی طرح عرض گزار ہی رہتا ہے اور سڑکوں پر بورڈ لکھے ہوتے ہیں چلتے رہیے ورنہ گولی ماردی جائے گی، ورنہ حوالہ پولیس کر دیا جائے۔ پبلک یوٹیلٹی کے دفاتر سے بھی عوام کو ایسے مخاطب کیا جاتا ہے جیسے وہ شہری نہیں، آج بھی رعیت ہی ہوں۔ رویوں میں ہی انسان دوستی نہیں ہے۔ کہیں 'خبردار' سے مخاطب کیے جاتے ہیں کہیں 'تنبیہ' سے۔ بیوروکریسی جیسے ادارے تفنن طبع کے لیے تو 'سول سرونٹ' ہیں لیکن رویے وہی ایسٹ انڈیا کمپنی والے۔ عوام سے کٹے ہوئے اور عوام سے بہت دور۔ شہری کو ان افسران تک پہنچنے کے لیے آج بھی قریب ویسے ہی 'معززین' کی حاجت رہتی ہے جنھیں برطانوی نوآبادیات میں 'کرسی نشیں' کا درجہ دیا گیا تھا۔ اسی رویے اور اسی مجبوری کا دوسرا نام 'تھانہ کچہری' کلچر ہے جو ہماری مروجہ دیہی سیاست میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ کلچر جب تک نہیں بدلتا، نوآبادیاتی قوانین میں جزوی ترمیم سے بھی کوئی خیر برآمد ہونا ممکن نہیں۔

باب ہفتم

یہ احساس کمتری کب تک؟

کیا اس نو آبادیاتی نظام قانون کے آزار سے نجات کی کوئی صورت موجود ہے اور موجود ہے تو اس کے خدو خال کیا ہوں گے؟

اس حقیقت کا ابطال ممکن نہیں کہ ان نو آبادیاتی قوانین میں چند مقامات پر ترامیم سے اصلاح احوال ممکن نہیں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اس سارے نو آبادیاتی نظام قانون کو لپیٹ دیا جائے اور اس کی جگہ ایک نیا نظام قانون متعارف کرایا جائے۔ اس نظام کو اگر اس کی جڑ سے نہیں اکھاڑا جاتا تو جتنی بھی رفو گری کر لی جائے، نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو گی۔

اس نو آبادیاتی نظام کے اندر رہتے ہوئے اصلاح احوال کے لیے بہت سی کوششیں پہلے ہی کی جا چکی ہیں اور ان کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ہمارے ہاں بعض قوانین کی اسلامائزیشن بھی ہو چکی لیکن یہ عمل سماج میں کسی معنوی تبدیلی کا باعث نہیں بن سکا کیونکہ نظام قانون کا ڈھانچہ وہی نو آبادیاتی ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں دستور پاکستان میں بنیادی انسانی حقوق موجود ہیں لیکن وہ اقوال زریں کی صورت کتاب کی رونق تو ہیں مگر عملی زندگی کے حقائق اس رونق سے مختلف ہیں۔ دستور کے باب دوم میں حکمت عملی کے بنیادی اصول وضع کر دیے گئے ہیں لیکن یہ رہنما اصول بھی عملی زندگی کی حقیقتوں پر کم ہی اثر انداز ہو سکے ہیں۔

آئین میں بنیادی انسانی حقوق اور حکمت عملی کے رہنما اصولوں کے باب میں ہونے والی یہ ساری مشق، جو اپنے متن کے اعتبار سے غیر معمولی ہے، اگر معاشرے میں مروج نظام قانون میں کسی معنوی تبدیلی کا باعث نہیں بن سکی تو یہ گویا اس بات کا اعلان ہے کہ جب تک نو آبادیاتی قانون کا بنیادی ڈھانچہ برقرار ہے تب تک کوئی رفو گری کام آسکتی ہے نہ ہی آئین میں لکھے لفظوں کی حرمت زمینی حقائق کو بدل سکتی ہے۔اس بنیادی ڈھانچے کو جڑ سے اکھاڑے بغیر اصلاح احوال کے لیے ہونے والی ہر کوشش اور ہر قانون سازی صرف دستاویزی اقوال زریں کا حجم بڑھا سکتی ہے، کسی حقیقی تبدیلی پر منتج نہیں ہو سکتی۔جی کے بہلانے کی ہزار صورتیں ہو سکتی ہیں لیکن اصلاح احوال کی ایک ہی شکل ہے۔ نو آبادیاتی دور کے اس ڈھانچے کا مکمل خاتمہ ضروری ہے۔اس کی شاخیں تراشنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ حتیٰ کہ اس کا تنا کاٹ ڈالنے سے بھی مطلوبہ مقاصد کا حصول ناممکن ہے۔اس نو آبادیاتی نظام قانون کو اس کی جڑ سے اکھاڑنا ہو گا۔

یہ کام مگر آسان نہیں ہے، یہ وہ کوہ کنی ہے جس کے تصور ہی سے فرہاد کا زہرہ آب ہو جائے۔اس میں دو بڑے مسائل ہیں۔

پہلا مسئلہ قانون سازی کے باب میں ہماری پارلیمان کی نیت اور اہلیت کا ہے۔اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اسی پارلیمان نے ہمیں ایک متفقہ آئین دیا ہے۔لیکن اس حقیقت کا ابطال بھی آسان نہیں کہ آئین کو اس کی روح کے ساتھ نافذ کرنے میں اس پارلیمان نے غیر معمولی غفلت اور نااہلی کا ثبوت دیا ہے۔آئین سازی اب شاید اس کے نامہ اعمال کی 'مستثنیات' میں شمار ہو گی۔ہمارے ہاں پارلیمانی روایات کو یکسر نظر انداز کر کے، عجلت میں اور کثرت سے جس طرح شخصی اور گروہی مفادات کے لیے قانون سازی ہوتی آ رہی ہے، یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ایسے میں اگر ایک مکمل نیا قانونی ڈھانچہ کھڑا کرنے کا فریضہ اس پارلیمان کے ذمے لگایا جاتا

ہے تو کیا وہ اس پر پورا اترنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ قانون سازوں کی شخصی، گروہی اور فکری عصبیت ایک ایسا نظام قانون متعارف کرائے گی کہ لوگ نو آبادیاتی قانون کی واردات کو بھول جائیں گے اور انھیں ایک "نئے نو آبادیاتی نظام قانون" کا سامنا ہو گا۔ منیر نیازی کی طرح سماج کو بھی ایک دریا سے نکل کر ایک اور دریا کا سامنا ہو گا۔

دوسرا خطرہ انارکی پیدا ہونے کا ہے۔ مسلح جدوجہد کے ذریعے نظام میں تبدیلی پر مائل قوتوں کی فکری اور عملی فالٹ لائن اس ملک میں موجود ہے۔ایک بار موجود نظام قانون کو لپیٹ دیا گیا تو نئے قانون کی تیاری میں ایک ایسا فکری اور عملی بحران جنم لے سکتا ہے جو سماج کو کسی ایسے سے دوچار کر دے۔ایسے میں یہ خطرہ موجود ہے کہ ایک نظام قانون کا ڈھانچہ منہدم کر کے ایک نئے ڈھانچے کی تلاش میں ہم کسی سانحے سے دوچار نہ ہو جائیں۔

لیکن کیا ان دو خطرات کی وجہ سے اس نو آبادیاتی نظام قانون کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا جائے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔راستہ پر خطر ہے اس لیے حکمت کو زادِ راہ بنا کر آگے بڑھنا ہو گا۔اس ضمن میں چند چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ سارا عمل یکایک، اچانک کسی انقلاب کی شکل میں برپا نہیں ہونا چاہیے۔بلکہ اس کا ظہور بتدریج اور ارتقائی شکل میں ہونا چاہیے۔خود برطانوی نو آبادیات نے بر صغیر میں رائج مسلمانوں کے قوانین کو اچانک ختم نہیں کیا۔مغلوں کے قوانین کی جگہ نو آبادیاتی قانون بھی بتدریج لایا گیا۔یہ سلسلہ 1726ء کے چارٹر سے شروع ہوا اور 1857ء کی جنگ آزادی کو کچل کر اسے مکمل کر دیا گیا۔یہ نظام ختم بھی تدریجی عمل کے نتیجے میں ہو گا۔احساس کی آنچ اس عمل کو تیز ضرور کر سکتی ہے لیکن یہ تبدیلی کسی انقلاب کی صورت برپا نہیں ہو گی بلکہ اس کا ظہور ارتقائی شکل میں ہو گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس معاملے میں پارلیمان کے ساتھ ساتھ عدلیہ کا کردار بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ پارلیمان کے بنائے قوانین کی تعبیر و تشریح عدلیہ کا کام ہے۔ اس تشریح کو عدالتی نظیر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اس کا درجہ معنوی طور پر قانون ہی کا ہوتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو قانون کے متن پر اس کی وہ شرح غالب آجاتی ہے جو عدلیہ نے کی ہوتی ہے۔ عدلیہ اگر کامن لاء کی روایات اور عدالتی نظائر کو ثانوی حیثیت دیتے ہوئے، خالصتاً اپنے سماج، اپنی روایات، اپنے مذہب اور اپنے آئین کی روشنی میں قوانین کی تشریح کرنا شروع کردے تو اس سے بھی معاملات تیزی سے بہتری کی جانب گامزن ہو سکتے ہیں۔

آئین میں بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے بھی غیر معمولی حساسیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور آرٹیکل 8 میں لکھا ہے کہ ہر قانون یا ہر وہ روایت جو قانون کے درجے کو پہنچ چکی ہو، اگر آئین میں دیے گئے بنیادی انسانی حقوق سے متصادم ہو تو کالعدم اور منسوخ سمجھی جائے گی۔ اسی طرح دستور پاکستان کے آرٹیکل 227 میں لکھا ہے کہ تمام موجودہ قوانین کا قرآن و سنت میں مذکور احکام اسلام کے مطابق ہونا لازمی ہے۔ عدالتیں اگر قوانین کی شرح کرتے ہوئے یا کوئی شرح قبول کرتے ہوئے کامن لاء کے عدالتی نظائر اور روایات کے بجائے آئین کے ان دو بنیادی اصولوں کی بالادستی کو یقینی بنالیں تو صورت کافی حد تک تبدیل ہو سکتی ہے۔

اس نکتے کو سمجھنے کے لیے سپریم کورٹ کا ایک حالیہ فیصلہ کفایت کرتا ہے۔ اس فیصلے میں جناب جسٹس قاضی فائز عیسی اور جناب جسٹس طارق مسعود نے لکھا ہے کہ ہمارے پاکستان کے جج صاحبان کے ذہن میں بھی بسا اوقات قدیم یورپی اور امریکی تصورات سرایت کر جاتے ہیں۔ عدالت عظمی کے فیصلے میں لکھے گئے الفاظ کی معنویت کے پیش نظر، مناسب ہوگا کہ وہ الفاظ یہاں نقل کر دیے جائیں۔ عدالت نے لکھا:

> "We however find that old European and American concepts at times permeate into the thinking even of judges in Pakistan."[1]

اسی مقدمے میں، جو ایک خاتون کے حق مہر سے متعلق تھا اور پشاور ہائی کورٹ خاتون کے خلاف فیصلہ دے چکی تھی، عدالت عظمی نے اسی پیراگراف میں مغرب کے Coverture کے تصور پر نقد کیا۔ یہ اصل میں انگریزی قانون کا مفروضہ ہے شادی شدہ عورت اور اس کا شوہر قانون کی نظر میں ایک شخص کی حیثیت رکھتے ہیں اور بیوی کی شوہر سے الگ کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ سپریم کورٹ نے اسی ظلم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فیصلے میں لکھا کہ امریکہ میں تو 1960ء تک اور برطانیہ میں 1975ء تک شادی شدہ خواتین اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف بنک اکاؤنٹ نہیں کھول سکتی تھیں۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے میں ایک جہانِ معنی آباد ہے۔ یہ فکر اگر ایک حکمت عملی میں ڈھل جائے تو تبدیلی کا نقش اول بن سکتی ہے۔

نوآبادیاتی نظام قانون کے خاتمے اور اس کے متبادل کے نفاذ کی یہ ساری مشق جمہوری طریقے سے ہونی چاہیے، بذریعہ پارلیمان اور عدلیہ ہونی چاہیے اور آئین پاکستان کے متعین دائرہ کار کے اندر رہ کر ہونی چاہیے۔ چوں کہ ان قوانین کے بعض ضمنی حوالے آئین میں بھی موجود ہیں اس لیے جب یہ سلسلہ آگے بڑھے گا تو آئین پاکستان میں بھی ان چند مقامات پر جزوی ترامیم کی ضرورت پڑے گی[2] اور یہ ترمیم آئین کی روح سے متصادم نہیں بلکہ ہم آہنگ ہوگی۔

---

[1] فواد اسحق بنام مہرین منصور، PLD 2020 SC 269۔

[2] دستور پاکستان میں، اس ضمن میں، تین چیزیں قابل توجہ ہوں گی۔

لیکن نوآبادیاتی قانونی ڈھانچے سے نجات سے پہلے لازم ہے کہ یہ سماج اپنی فکری اور نفسیاتی گرہوں سے نجات حاصل کرے جو اس نوآبادیاتی نظام کی باقیات کی صورت اسے گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ جیسے اس کتاب کے پہلے باب میں تفصیل سے بیان کیا گیا کہ نوآبادیاتی دور میں نظام قانون کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک ہمہ جہت نوآبادیاتی نظام کا جزو ہے، کل نہیں۔ اس سے نجات کے لیے یہ کافی نہیں کہ نظام قانون تبدیل کر لیا جائے، اس کے لیے ناگزیر ہے کہ اس

اول: دستور میں ایک عارضی بندوبست کے تحت آرٹیکل 268 میں نوآبادیاتی قوانین کو تحفظ دیا گیا ہے۔ اسے دیکھنا پڑے گا۔

دوم: دستور میں بنیادی انسانی حقوق کو رائج قوانین سے مشروط کیا گیا ہے۔ آزادی رائے ہو، اجتماع کا حق ہو غرض یہ کہ جتنے بھی بنیادی انسانی حقوق ہیں، انھیں قانون سے مشروط کیا گیا ہے جو ایک منطقی سی بات ہے۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ اب قانون تو نوآبادیاتی دور کا ہے۔ یعنی ان مروجہ نوآبادیاتی دور کے قوانین کی وجہ سے آئین کی روح دھندلا رہی ہے۔ اس سکیم پر از سر نو توجہ دینا ہو گی اور یا تو ان نوآبادیاتی قوانین کا متن آئین کی روح کے مطابق کرنا ہو گا یا ان کی شرح میں ان کے معانی بدلنا ہوں گے۔

سوم: آئین میں ہم نے نوآبادیاتی نفسیات کے تحت اسی دور غلامی کے بعض قوانین کو بطور خاص جگہ دی ہے، اس پر نظر ثانی کرنا ہو گی کہ کیا یہ آئین کی بنیادی سکیم اور روح کے مطابق ہے۔ جیسے ہم نے برطانوی نوآبادیاتی دور کے لینڈ ایکوی زیشن کے قانون میں اصلاح کے بجائے اس کا دائرہ کار وسیع کر دیا اور لینڈ ایکوی زیشن ایکٹ، 1973ء کے تحت ہاؤسنگ سیکٹر کو بھی مفاد عامہ قرار دیتے ہوئے قانون بنا دیا کہ اب کسی کی ہاؤسنگ کالونی کے لیے بھی لوگوں کی زمین ایکوائر کی جا سکے گی، وہیں ہم نے یہ بات دستور پاکستان کے آرٹیکل 24 میں بھی لکھ دی کہ ہاؤسنگ کالونی کے لیے بھی زمین ایکوائر کی جا سکتی ہے۔ اب یہ جائزہ لینا ہو گا کہ نوآبادیاتی دور کے ان قوانین اور اس طرز فکر کے جو اثرات آئین میں آ گئے ہیں اور آئین کے حقیقی حسن کو دھندلا رہے ہیں ان سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔ یہ کام یقیناً کٹھن ہے مگر کرنے کا کام یہی ہے۔

احساس کمتری، مرعوبیت اور خود شکستگی کے بیمار احساس سے نکالا جائے جو نوآبادیاتی دور نے ہماری ہڈیوں کے گودے تک میں اتار دیا ہے۔ ردعمل کی نفسیات کا شکار ہوئے بغیر، توازن اور اعتدال کے ساتھ باوقار انداز سے، ہمیں اپنی گم گشتہ تہذیبی شناخت کو از سر نو دریافت کرنا ہو گا۔

خرابی ہمارے اس احساس کمتری میں ہے جو ہماری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ یہ چند سالوں پر مشتمل کوئی حادثہ نہیں ہے۔ یہ صدیوں پر محیط سامراجی نسل پرست شعوری اہتمام ہے جس نے ہماری نفسیات اور شعور کو جکڑ رکھا ہے۔ جب تک اس سے نجات حاصل نہیں ہوتی، تب تک قانون بدل بھی دیا جائے تو صورت حال بہتر نہیں ہو سکتی۔ ان مرعوبیت، احساس کمتری اور لاشعور میں پیوست غلامی سے نجات کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس واردات کی مبادیات کو سمجھیں اور ہمیں معلوم ہو کہ ایسا کیا ہوا کہ ایک شاندار تہذیب کے حامل لوگ اپنی ذلت و جہالت اور سفید فام قوم کی رفعت اور برتری کے یوں قائل ہوئے کہ آج بھی اس تصور پر نظر ثانی کو تیار نہیں۔

انگریز جب شروع میں برصغیر میں آئے تو ان کا رویہ مختلف تھا۔ جیسے جیسے وہ اقتدار کے قریب ہوتے گئے ان کا رویہ تبدیل ہوتا گیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد یہ رویہ بالکل مختلف ہو گیا۔ یہ ایک تدریجی سفر تھا جس میں شعوری اہتمام کے ساتھ برصغیر کے رہنے والوں کو قائل کیا گیا کہ وہ ایک کمتر، ہیچ، قابل نفرت اور غیر مہذب قوم ہیں اور ان کے لیے مہذب اور قابل عزت ہونے کا ایک ہی رستہ ہے کہ وہ مقامی تہذیب کے ہر رنگ کو چھوڑ کر نوآبادیاتی آقاؤں کے کلچر کو اپنا لیں۔

ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ شروع کے زمانے میں انگریزوں کے مقامی لوگوں سے اچھے تعلقات تھے۔ انگریز ہندوستانی کلچر اور ثقافت میں رنگے گئے تھے۔ وہ مقامی کلچر کو اپنا لیتے تھے۔ ان کا لباس، ان کا کھانا حتیٰ کہ رقص اور موسیقی تک کا ذوق مقامی ماحول کے مطابق ڈھل جاتا

تھا۔ یہ مقامی اشرافیہ کے ادب آداب اختیار کرتے تھے۔ اردو اور فارسی نہ صرف بولتے تھے بلکہ ان زبانوں میں شاعری بھی کرتے تھے۔ جب فرینکٹن نامی ایک سیاح نے جارج تامس سے انٹرویو لیا تو وہ اس وقت انگریزی سے زیادہ اچھی فارسی بولتا تھا۔[3]

ڈاکٹر مبارک علی اس واردات کا پس منظر چند نکات میں واضح کرتے ہیں۔ ان کے مطابق:

1. شروع میں انگریزوں کا رویہ مختلف تھا۔ گورنر جنرل وارن ہسٹنگز کے زمانے تک انگریز اور ہندوستان کے اعلیٰ طبقے میں سماجی طور پر مساوی تعلقات رہے۔ ان دونوں کے درمیان نہ صرف علمی گفتگو اور بحث مباحثے رہتے تھے بلکہ سیر و تفریح میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ اس وقت تک انگریز ہندوستان کے ماضی اور اس کی تاریخ سے متاثر تھے۔
2. انگریزوں کے رویے میں آہستہ آہستہ اس وقت سے تبدیلی آنا شروع ہوئی جب ان کی طاقت اور اقتدار مستحکم ہوتا چلا گیا۔ اب ہندوستانیوں کے ساتھ ان کا رشتہ فاتح اور مفتوح اور حاکم اور محکوم کا ہو گیا۔
3. جب یہ نیا رشتہ قائم ہو گیا تو انھوں نے ہندوستانیوں کو ذلیل و خوار کرنا شروع کر دیا۔ اب ان کے نزدیک ہر مقامی چیز قابل تضحیک و نفرت تھی۔ مقامی لوگوں کی جسمانی ساخت، ان کا لباس، ان کی زبان، ان کے ادب آداب یہ سب تہذیب سے گرے ہوئے تھے۔
4. اس رویے کا مقصد یہ تھا کہ اپنے رعب و دبدبے کو قائم رکھا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ ہندوستان کی مقامی تہذیب ان سے کم تر ہے اور یہ لوگ غیر مہذب اور وحشی ہیں۔

3 مبارک علی، برطانوی راج: ایک تجزیہ (لاہور: فکشن ہاؤس، 1999ء)، 52۔

5. مقامی لوگوں کو نفسیاتی طور پر کم تری کا احساس دلانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اگر انھیں برتری یا حتیٰ کہ برابری کا احساس بھی ہوتا تو وہ برطانوی حکومت کے خلاف مزاحمت کے لیے تیار رہتے اور جب ان کے حقوق کو غصب کیا جاتا تو وہ ان کی واپسی کا مطالبہ کرتے۔ اس لیے ان میں تہذیبی کم تری کے احساسات پیدا کیے گئے تاکہ وہ حکومت اور کے عہدیداروں سے مرعوب رہیں، ان کی اطاعت کریں اور ان سے کسی قسم کے مطالبات نہ کریں۔ بلکہ اگر کچھ حاصل کرنا ہو تو اس کے لیے ان سے درخواست کریں اور درخواست منظور ہو جائے تو شکر گزار ہوں۔
6. چنانچہ اس مکمل تہذیبی واردات میں مقامی لوگوں کو باور کرایا گیا کہ انگریز کلچر برتر ہے۔ چلم پینا تو خراب بات ہے مگر سگار پینا تہذیب کی علامت ہے۔ ہندوستانی کھانے بدمزہ ہو گئے اور ان کی جگہ یورپی کھانوں نے لے لی۔
7. مقامی لوگوں کو جاہل اور گنوار قرار دیتے ہوئے انھیں باقاعدہ تعلیم دی گئی کہ انگریز عورتوں سے بات کیسے کرنی ہے۔ اس مقصد کے لیے 1911ء میں ایک کتاب لکھی گئی جس کا نام تھا English Etiquette for Indian Gentlemen، جس میں بتایا گیا کہ انگریز سے بات چیت کے آداب کیا ہیں۔
8. چوں کہ انگریز بالاتر قرار دیے گئے اور مقامی لوگ نیچ، کمتر، جاہل اور گنوار اور غیر مہذب، تو یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ کوئی انگریز رقاصہ کسی مقامی آدمی کے سامنے رقص نہ کرے۔ یہاں تک کہ یورپی طوائفوں پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ کسی ہندوستانی سے جنسی تعلقات نہ رکھیں۔ راجوں اور نوابوں کو یورپ جانے کی اجازت دینے میں بھی تامل کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ کہیں

کم تر درجے کے لوگ یورپ جا کر اعلی درجے کی انگریز قوم کی عورتوں سے تعلقات قائم نہ کرلیں۔[4]

جس تہذیبی واردات کا ذکر ڈاکٹر مبارک علی نے کیا ہے، اسی کا تذکرہ سر سید احمد خان کے ہاں بھی ملتا ہے۔ ان کے دو مضامین بہت اہم ہیں۔ ایک 'نئی تہذیب' اور دوسرا 'جوتے کا مقدمہ'۔ نئی تہذیب میں وہ لکھتے ہیں:

"یورپین جنٹلمین ہماری قوم کے پرانے فیشن کی تضحیک کرتے ہیں تو کوئی درجہ حقارت کا اٹھا نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستانی بندر کے موافق ہیں جو چوتڑوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہیں۔ بندر کے موافق کھانے میں ہاتھ سان کر ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں۔ کوئی تمیز ان کی معاشرت میں نہیں ہے۔ وحشیوں سے کسی قدر بہتر ان کا لباس ہے۔ گو قطع اس سے مشابہ ہے جو جنگلی وحشی نا مہذب قومیں ابھی تک پہنتی ہیں۔ ایک بہت بڑے مجمع میں، جس میں بہت سی لیڈیاں اور جنٹل مین شریک تھے ایک نہایت معزز ہندوستانی اپنا قومی لباس پہنے آگیا۔ جس حقارت اور تعجب سے سب نے اس کو دیکھا وہ کسی طرح قلم سے بیان نہیں ہو سکتا۔ اکثر لوگ کہتے تھے کہ یہ عجائب خانہ میں رکھنے کے لائق ہیں۔"[5]

اس تہذیبی واردات کے اثرات اتنے سنگین ہیں کہ آج بھی اردو میں بات کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور غیر ضروری طور پر انگریزی میں ابلاغ علم و تہذیب کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ زبان ابلاغ کا ذریعہ ہوتی ہے اور انگریزی زبان بین الاقوامی ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ اس میں بات کرنے میں ہرگز کوئی مضائقہ نہیں لیکن جس محفل میں سب لوگ مقامی ہوں وہاں اردو سے گریز

4 مبارک علی، برطانوی راج: ایک تجزیہ (لاہور: فکشن ہاؤس، 1999ء۔ صفحہ 52-66۔

5 مقالات سر سید، 585، مبارک علی، برطانوی راج: ایک تجزیہ، 57۔

کو احساس کمتری کے سوا اور کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اب تو یہ اہتمام بھی راسخ ہوتا جا رہا ہے کہ 'افسر شاہی' کندھے اچکا کر معذرت کر لے کہ اردو نہیں آتی تو یہ علم و فضیلت کی سند قرار پاتی ہے۔

یہی معاملہ لباس کا ہے۔ ہر انسان کا حق ہے وہ اپنے ذوق کے مطابق کوئی سا بھی لباس پہن لے۔ لیکن جب بالادست طبقہ نوآبادیاتی پیرہن میں ہوگا اور خدام ادب اور نوکروں کو اچکن اور جناح کیپ پہنائی جائے گی اور دستار کو، جو پنجاب کی تہذیبی علامت ہے، کلبوں اور ہوٹلوں کے باہر خادموں کے لیے مختص کر دیا جائے گا تو یہ وہ رویہ ہے جس کا علم و تہذیب کی دنیا میں کوئی اعتبار نہیں۔ اس کی جڑیں نوآبادیاتی احساس کمتری میں ہیں جو ہماری ہڈیوں کے گودے میں اتر چکا ہے۔

ایسا ہی رویہ ناموں کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ ایک زمانہ مگر یہ بھی تھا کہ ایسے ناموں سے شرمندگی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ مغل اقتدار کے عروج میں جب انگریز یہاں آئے تو انھوں نے اپنے نام بدل کر مقامی نام رکھ لیے۔ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

شروع میں جب انگریز یہاں آئے تو ان میں سے اکثر کے نام ہندوستانی ہو گئے۔ مثلاً راڈن ہارڈٹ نے اپنا نام 'سمرس' رکھا اور اس سے صمد ہو گیا۔ جارج ہیسنگ 'جورس صاحب' ہو گئے، لوئی بورژیں 'لوئی صاحب' بن گئے، رابرسدھر لینڈ 'ستلج صاحب' قرار پائے، کیپٹن برائن 'برونڈی صاحب' اور اسکنر 'سکندر صاحب' کے نام سے مشہور ہوئے۔[6]

یہ بہت بعد کی بات ہے جب غلامی ہمیں راس آگئی اور ہم مقامی تہذیب کے ہر رنگ پر شرمندہ ہونے لگے، ہم نے نام انگریزوں جیسے کر لیے، کھانا ان کی طرح کھانے لگے اور مقامی لباس

6 مبارک علی، آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان (سندھ: آگہی پبلی کیشنز، 1996ء)، 113۔

سے ہمیں شرم آنے لگی۔ لیکن اس سب کے باوجود 'غلاموں' کو پزیرائی نہ مل سکی۔ ایف جی ہچنگز کی روایت ہے کہ وائسرائے کرزن نے ایسے کرداروں کے بارے میں کہا تھا کہ ''وہ نظارا بڑا مضحکہ خیز ہوتا ہے جب ہندوستانیوں کو چھری کانٹے سے کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔''[7]

اول مقامی لوگوں کی تہذیب وثقافت کی توہین کی گئی اور جب احساس کمتری کے شکار یہ لوگ اپنی تہذیب ترک کر کے انگریز تہذیب میں رنگے گئے تو ایک بار پھر ان کی تذلیل کی جانے لگی۔ سر سید احمد خان لکھتے ہیں: ''اکثروں کو ان میں سے جوش آجاتا ہے کہ یہ غلام ہماری برابری کرنے پر آمادہ ہوا ہے۔ پاجی غلام یہ چاہتا ہے کہ ہم بطور دوستوں کے اس کی مدارات کریں۔ یہ غلام چاہتا ہے کہ ہمارا دوست بنے اور برابر کے دوستوں کی طرح ہم اس سے ملیں۔''[8]

یہی وہ نفرت آمیز رویہ تھا جس کی وجہ سے انڈین سول سروس کے افسران کے لیے حکم جاری کیا گیا کہ وہ عام لوگوں سے دور رہیں اور ان سے سماجی تعلقات نہ رکھیں۔ آج بھی افسر شاہی عملاً اسی حکم نامے کے تحت کام کر رہی ہے اور یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ عام آدمی کی ان تک پہنچ نہ ہو۔ اسی لیے کہا جاتا تھا کہ انڈین سول سروس نہ انڈین ہے نہ سول ہے نہ سروس ہے۔ یہی ساری سول سروس پاکستان کو میراث میں آئی اور اس کے بنیادی ڈھانچے میں ہم نے آج تک کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس کا رویہ آج بھی ایسا ہے کہ یہ نہ پاکستانی لگتی ہے نہ سول اور نہ ہی سروس۔

برطانوی اخبار دی گارڈین کی رپورٹ کے مطابق برطانوی نوآبادیاتی نظام کی مقامی

[7] ایف۔جی ہچنگز، *The Illusions of Permanence: The British Imperialism in India* (پرنسٹن: بلیک دل پبلشنگ ورسٹی پریس، 1996ء)، 29۔

[8] مقالات سر سید، 586۔ بحوالہ: مبارک علی، برطانوی راج: ایک تجزیہ، 64۔

لوگوں سے حقارت کا یہ عالم تھا کہ یورپی ریسٹورنٹس کے باہر لکھا ہوتا تھا: کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔[9]

مقامی لوگوں کا صرف معاشی استحصال ہی نہیں کیا گیا ان کا فکری اور نفسیاتی استحصال بھی کیا گیا۔ انھیں نفسیاتی اور شعوری طور پر ایسی پسماندگی میں ڈالا گیا کہ وہ آج تک اس سے باہر نہیں نکل پا رہے۔ ایک اہتمام سے ایسی منظر کشی کی گئی جس میں مقامی تہذیب کا ہر رنگ کم تر اور گھٹیا محسوس ہو۔ مغل حکمرانوں کی یک طرفہ تصویر پیش کی گئی۔ بلاشبہ دور زوال کی خامیاں پہاڑ جیسی تھیں لیکن انگریز کے ہاں اس پہلو کا ابلاغ حکمت عملی کے تحت تھا۔ اورنگزیب عالمگیر پر تو بہت گرہیں لگائی گئیں کہ وہ ٹوپیاں سی کر 'گزارا' کرتے تھے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ لارڈ کلائیو کیسے گزارا کرتے تھے اور انھوں نے ہندوستان سے کتنی دولت لوٹی اور آخر میں خودکشی کیوں کی؟ باقی کے امرا کی اجتماعی لوٹ مار اور برطانیہ کی معاشی واردات کا حجم تو الگ قصہ ہے صرف لارڈ کلائیو نے صرف بنگال سے لوٹی گئی رقم میں سے اپنے لیے جو رقم رکھ لی اس کی مالیت تین کروڑ ڈالر بنتی ہے۔ اسی رقم سے جب اس نے برطانیہ میں جاگیر خریدی اور اس کا نام پلاسی رکھا اور پیسے دے کر اپنے لیے اور اپنے باپ کے لیے پارلیمان کی نشست خریدی[10] تو برطانیہ میں کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ عالی جاہ یہ رقم کہاں سے آئی۔ شاید سب کو یقین ہو کہ لارڈ صاحب بھی ٹوپیاں سی کر ہی گزارا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے اسی 'محنت' کے اعتراف میں انھیں 'سر' کا خطاب دیا گیا۔ تاہم لارڈ صاحب

[9] ایش سرکار، "My great great aunt was a terrorist: women's politics went beyond the vote"، دی گارڈین، 5 فروری، 2018ء۔

[10] ظفر سید، ''انگریزوں نے ہندوستان کو کتنا مالی نقصان پہنچایا؟''، بی بی سی اردو، 15 اگست 2018ء۔

کا اپنا اعتراف یہ ہے کہ انھوں نے ابھی بھی 'ہاتھ ہولا' رکھا تھا۔[11]

یہ بات مقامی لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے کے لیے کہ وہ گھٹیا اور احمق ہیں اور ان کی تاریخ میں ایسا کچھ بھی نہیں جو قابل فخر ہو، اہتمام سے یکطرفہ تاریخ لکھوائی گئی اور اگر کسی نے مقامی تہذیب کے کسی رنگ کے بارے میں کچھ اچھا لکھا تو اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی جاتی۔ کے۔ این۔ پانی کر نے لکھا کہ سنسر شپ کا یہ عالم تھا کہ 1917ء میں بمبئی کے گورنر نے سی۔ اے کن سیڈ کو مرہٹہ تاریخ چھاپنے سے روک دیا کیونکہ اس میں شیواجی کے بارے میں اچھے کلمات تھے۔[12] اگر مرہٹوں کے بارے میں انگریز کی حساسیت کا یہ عالم تھا تو تصور کیا جاتا ہے کہ مغل حکمرانوں کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہو گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مغل دور کی قانونی دستاویزات آج بہت کم دستیاب ہیں اور حتیٰ کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیئرمین نے بھی مسلم تہذیب اور قانون کے بارے میں کلمہ خیر لکھا تو ان کی کتابیں بھی غائب کر دی گئیں، آج ان کی صرف وہی کتابیں دستیاب نہیں ہیں جو اسلامی تہذیب اور اسلامی قانون پر لکھی گئیں۔

برطانوی نوآبادیاتی قانون کوئی ایسی واردات نہیں جو اچانک ہی رونما ہو گئی ہو۔ یہ اس وسیع تر تہذیبی واردات کا ایک پہلو تھا جو برصغیر میں برپا کی گئی۔ اس واردات نے لوگوں کے ذہن میں یہ بات راسخ کر دی کہ مقامی تہذیب شرمندگی کے سوا کچھ نہیں اور برطانوی تہذیب شرف انسانیت کا استعارہ ہے۔ مقامی اقدار اور تہذیب سے اگر آج بھی کچھ لوگ شرمندہ شرمندہ سے

[11] ایضاً۔

[12] کے۔این۔پانی کر، Culture, Ideology, Hegemony (دہلی: ساؤتھ ایشین سٹڈیز، 1998ء)، 38۔

پھرتے ہیں اور ان کے نزدیک دنیا کی واحد صداقت برطانوی نظام ہے تو یہ اسی واردات کے فکری اور نفسیاتی اثرات ہیں۔

اس نفسیاتی گرہ کو کھولنا ہو گا۔ یہ بات شعوری طور پر سمجھنا ہو گی کہ ہم اب سلطنت برطانیہ کی رعایا اور نوکر نہیں ایک آزاد ملک کے شہری ہیں۔ ہماری تہذیب و ثقافت اور اس سے وابستہ قدریں ہمارے لیے باعث شرم نہیں۔ ہم نیچ اور گھٹیا لوگ نہیں برابر درجے کے باوقار شہری ہیں۔ ہمیں اب *English Etiquette for Indian Gentlemen* کے مطالعے سے 'تہذیب' کشید کرنے کی ضرورت نہیں، ہماری اپنی تہذیبی اقدار موجود ہیں۔ جب تک احساس کمتری کی اس ذلت سے باہر نہیں نکلا جاتا، قانون میں ترامیم بھی کر لی جائیں تو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ بلکہ زیادہ خطرہ اس بات کا ہو گا کہ اس کے نتیجے میں ایک 'نیا نوآبادیاتی نظام' تشکیل پا جائے۔

برطانوی ماہر تعلیم ولیم ٹریگو ویب نے *English Etiquette for Indian Gentlemen* کے نام سے کتاب لکھی، جسے ٹھاکر سپنک اینڈ کمپنی نے بمبئی سے 1818ء میں شائع کیا۔ اسی طرح ہیرلڈ۔ آر۔ ہارڈ لیس نے *The Indian Gentleman's Guide to English Etiquette, Conversation and Correspondence* کے نام سے کتاب لکھی جو اترپردیش کے شہر چنار سے 1920ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتابیں برصغیر کے 'ہندوستانی جنٹل مینوں' کو آداب غلامی سکھانے کے لیے لکھی گئیں۔ لارڈ میکالے نے جو کہا تھا کہ ہمیں ایک ایسا طبقہ چاہیے جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن جو اپنے ذوق، فکر، اصول اور اپنے فہم کے اعتبار سے انگریز ہو، تو یوں سمجھیے کہ یہ کتابیں اسی مقصد کے تحت لکھی گئیں۔ چوں کہ برطانوی راج کے خاتمے کے وقت بیوروکریسی سے لے کر حکومتی اہلکاروں تک میں یہ آداب راسخ

ہو چکے تھے اور لاشعور کا حصہ بن چکے تھے، اس لیے ہمارے مقامی 'جنٹل مین' آج تک ان آداب غلامی کے خول سے باہر نہیں نکل سکے جو انھیں ان کتابوں میں سکھائے گئے۔

اپنے سماج کے بالادست طبقے کے مزاج کی رعونت اور عام آدمی کی جنم جنم کی عاجزی دیکھ کر گاہے حیرت ہوتی ہے کہ یہ شرف انسانی سے گرے ہوئے رویے ہماری عمومی مزاج کا حصہ کیسے بن گئے؟ ڈبلیو۔ٹی۔ ویب کی *English Etiquette for Indian Gentlemen* جیسی کتابیں اس سوال کا جواب ہیں۔

اس کتاب کے تعارف میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں تبدیلی کا عہد شروع ہو چکا ہے، صدیوں سے جن روایات کا احترام کیا جاتا تھا وہ اب تبدیل ہو رہی ہیں اور قدیم اقدار منہدم ہو چکی ہیں۔ پرانی اقدار اس قابل نہیں کہ انھیں لے کر چلا جائے، اب تہذیب مغرب کا زمانہ ہے تو اس زمانے میں اگر کوئی ہندوستانی جنٹل مین انگریزوں کے ساتھ رابطے میں رہنا چاہتا ہے تو اسے انگریزوں سے ملنے اور بات کرنے کے کچھ آداب سیکھنا ہوں گے۔ یہ کتاب 'مقامی جنٹل مینوں' کو یہی آداب سکھانے کے لیے لکھی گئی ہے۔[13]

اس کتاب کے نو ابواب ہیں۔ لباس سے لے کر طرز گفتگو اور کھانے سے لے کر چلنے تک کے لیے 'مقامی جنٹل مینوں' کو انگریزی تہذیب کے آداب سکھائے گئے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب بڑی دلچسپ ہے۔ کہیں ایسی بنیادی اخلاقی باتیں بتائی جا رہی ہیں کہ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کسی وحشی اور جاہل طبقے کو بنیادی اقدار سکھانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یعنی ان کے خیال میں مقامی

[13] ڈبلیو۔ ٹی۔ ویب، *English Etiquette for Indian Gentlemen* (کلکتہ: ٹھاکر سپنک اینڈ کمپنی، 1888ء)، 1۔

تہذیب اتنی پست تھی کہ بنیادی انسانی اقدار سے بھی لاعلم تھی۔ یہ وہ رویہ ہے جو سفید فام برتری کی نفسیات سے تشکیل پاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ تہذیب صرف اس کے پاس ہے باقی سب جاہل اور گنوار اور وحشی ہیں۔

کتاب میں بعض مقامات پر واضح طور پر آداب غلامی سکھائے گئے ہیں جنھیں آج بھی پڑھیں تو طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔ بار بار بتایا جاتا ہے کہ تمہارے طور طریقے متروک ہو چکے، اب تم انگریزی تہذیب سیکھ رہے ہو اس لیے خبردار کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جو انگریز 'جنٹل مین' کے مزاج کے خلاف ہو۔ چنانچہ تفصیل سے بتایا گیا ہے انگریز کے حضور حاضر ہونے کے آداب کیا ہیں، اس سے ملنے کے آداب کیا ہیں اور اس سے مخاطب کیسے ہونا ہے۔ مقامی یعنی ہندوستانی ڈیزائن کے جوتے پہن کر جانا ہے تو جوتے باہر برآمدے میں اتار کر اندر حاضر ہونا ہے، ایسے جوتے پہن کر انگریز کے حضور حاضر ہونا اس کی توہین ہے۔ خبردار مصافحے کے لیے اس وقت تک ہاتھ نہ بڑھایا جائے جب تک صاحب یا میم خود تمہیں اس قابل نہ سمجھیں۔ انگریزوں کو پیٹ درد جیسے الفاظ سننا پسند نہیں، خبردار جو کسی انڈین جنٹل مین نے ان کے سامنے پیٹ درد جیسے الفاظ استعمال کیے۔ کسی انگریز کو صرف اس کے نام سے نہیں پکارنا، القابات لگانا ضروری ہے۔ کسی یورپی سے سر راہ ملاقات ہو جائے تو ادب کے تقاضے کیسے پورے کرنے ہیں اور ان میں سے کسی کو مدعو کرنا ہے تو میزبانی کے آداب کیا ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔

اس کتاب میں مقامی تہذیب کو مکمل طور پر قصہ پارینہ قرار دیتے ہوئے سونے سے جاگنے تک اور جاگنے سے سونے تک، ہر معاملے اور ہر لمحے میں انگریزی طور طریقے سکھائے گئے ہیں۔ کھانا کیسے کھانا ہے۔ چھری کانٹا کیسے استعمال کرنا ہے۔ ہاتھ سے کھانا ایک برائی ہے خبردار جو کسی نے گوشت ہاتھ سے کھایا۔ اہتمام سے بتایا گیا کہ کسی میم صاحب کے کھانے کی تعریف مت

کرنا کیونکہ اس سے میم صاحب کی توہین ہو سکتی ہے کیونکہ میم صاحب کھانا نہیں بناتیں، نوکر بناتے ہیں۔ تمیز سکھائی گئی ہے کہ کسی پارٹی میں جائیں تو وہاں نوکروں کا شکریہ ادا کرنے سے باز رہنا ہے۔ خبردار کوئی نوکروں کا شکریہ ادا نہ کرے۔

اس میں ایک طرف انگریزوں کی حساسیت کا خیال رکھنے کا بار بار 'حکم' دیا گیا ہے لیکن دوسری جانب مقامی لوگوں سے کہا گیا ہے کہ تمہاری بے عزتی ہو جائے تو برا نہ مانا کرو۔ پہلے باب کی ہدایت نمبر نو کے مطابق مقامی لوگوں کو یہ تہذیب سکھائی گئی ہے کہ "زیادہ حساس مت بنو، تنقید برداشت کرنا سیکھو۔ وہ جو یہ برداشت کر سکے کہ اس کی غلطیاں اسے بتائی جائیں وہ جلد ان کی اصلاح کر سکتا ہے۔"

پھر جیسے سر سید احمد خان نے لکھا تھا کہ مقامی تہذیب کا تمسخر اڑا کر مقامی لوگوں کو ذلیل کیا جاتا ہے تو اسی ہدایت نامے میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ "بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہندوستانی 'جنٹل مین' یہ شکایت کرتے ہیں کہ یورپی لوگ ان سے بدسلوکی کرتے ہیں، ایسا نہیں ہوتا اور یہ محض مقامی لوگوں کی غلط فہمی اور ناسمجھی ہے۔ بعض مواقع پر جو انگریز درشت اور اکھڑا لہجہ اختیار کر لیتے ہیں تو وہ برحق ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یورپی لوگوں کے بارے میں دوستانہ رویہ اختیار کرنا سیکھو، ہر چیز کو شک کی نگاہ سے نہ دیکھا کرو۔"[14] یہ ہی رویہ ہے جس کا ذکر ڈاکٹر مبارک علی نے کیا ہے کہ نوآبادیاتی طاقتیں مقامی لوگوں کو انسانیت کے درجے سے گرا کر انھیں وحشی اور جانوروں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیتی ہیں۔[15]

---

14 ایضاً، 8-7۔

15 مبارک علی، برطانوی راج: ایک تجزیہ، 49۔

مقامی تہذیب واقدار کی تذلیل پر مشتمل عمومی 'ادب وآداب' کے بیان میں اگر کوئی کسر رہ گئی تھی کتاب کے آخر میں درخواست لکھنے کے 'آداب' بیان کر کے پوری کر دی گئی۔ باب نمبر گیارہ (11) میں بتایا گیا ہے کہ درخواست (Petition) وغیرہ کیسے لکھی جائیں اور ساتھ ہی نمونے کے طور پر کچھ درخواستیں لکھی گئی ہیں کہ ان کو دیکھ کر مقامی 'جنٹل مین' رہنمائی حاصل کریں۔ ان تمام درخواستوں میں تین چیزیں اہتمام سے بتائی گئی ہیں۔

اول درخواست کی شروعات، جو انتہائی غلامانہ، فدویانہ اور ذلت آمیز انداز سے کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر "I beg to say" کا انداز سکول کے بچوں کی درخواست سے لے کر سرکاری عرضیوں تک ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے تاکہ سکولوں سے ہی بچے یہ سیکھ لیں کہ آداب غلامی کیا ہوتے ہیں اور کیسے ایک دن کی چھٹی کی درخواست کا آغاز بھی 'Beg' سے ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زمانہ طالب علمی میں، ہمیں بھی درخواست لکھنے کا یہی انداز سکھایا گیا تھا۔ یعنی 1888ء میں ہمیں جو آداب غلامی سکھائے گئے وہ ایک صدی بعد بھی ہمارے ہاں تہذیب کی نشانی کے طور پر رائج تھے۔

دوم ہر درخواست کے آخر پر

Your servant, Your most obedient servant, Your humble servant

جیسے الفاظ لکھے گئے تھے تاکہ مقامی لوگوں کو معلوم رہے کہ ان کی حیثیت نوکر کی ہے اور وہ کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر سکتے بلکہ بھیک مانگ سکتے ہیں اور التجا کر سکتے ہیں۔

تیسری چیز انھیں یہ سکھائی گئی کہ بطور نوکر یہ جو التجا لے کر بھیک مانگنے کو عرضی لکھ رہے ہو تو یہ قبول ہو یا نہ ہو، محض تمہاری عرضی کا صاحب کے حضور پہنچ جانا ہی تمہارے لیے ایک

بہت بڑا اعزاز ہے۔ چنانچہ ہر درخواست کی شروعات سے پہلے یہ لکھنا سکھایا گیا کہ:

I have the honour to request.

ڈپٹی مجسٹریٹ کے کچھ عہدے مقامی لوگوں کو دیے گئے تھے تو ڈپٹی مجسٹریٹ کو سمجھایا گیا کہ اگر وہ چیف سیکرٹری کو کبھی کوئی مکتوب یا عرضی لکھ بھیجے تو اس کے آخر پر لکھے کہ:

Your most obedient servant.

سکولوں پر خاص توجہ دی گئی تاکہ بچے اور تدریسی عملہ اور سٹاف اچھی طرح آداب غلامی سیکھ لیں۔ چنانچہ بچوں کی ہر درخواست I beg سے شروع ہوتی اور ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز اپنے ڈائریکٹر کو تبادلے کی درخواست میں لکھے گا:

I beg, therefore, respectfully to request that…

انڈین سول سروس میں شمولیت کی درخواست میں سمجھایا گیا کہ تعلیمی قابلیت سے پہلے بتاؤ کہ کس خاندان سے تمہارا تعلق ہے اور اس میں سے کون کون پہلے سرکاری ملازمت کر رہا ہے۔

یہ وہ ایک پوری تہذیبی واردات تھی جو اس سماج پر مسلط کی گئی۔ چوں کہ اہم مناصب پر پھر یہی مقامی 'جنتل مین' فائز ہوئے اور نوآبادیاتی دور کے خاتمے کے بعد یہی افسر شاہی ہمیں ورثے میں ملی اور کسی نے اس سماجی واردات پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کی اس لیے یہ مقامی 'جنتل مین' آج بھی 'انگریزی آداب' سے سماج کی پشت لال اور ہری کیے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں ان پر نظر ثانی کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہی آداب شرف انسانی کی سند ہیں۔

اس احساس کمتری سے نکلنے کے لیے فکری اور نفسیاتی سطح پر ایک شعوری مشق ناگزیر ہے۔ یہ عمل البتہ کسی کو نیچا دکھانے یا مغربی تہذیب کو کمتر ثابت کرنے کے لیے نہیں ہونا چاہیے،

کیونکہ احساس کمتری کی طرح غیر ضروری رد عمل بھی ایک بیمار نفسیات کا نام ہے۔ یہ مشق صرف اپنے احساس کمتری سے نکلنے اور اپنے تہذیبی مقام کے درست تعین کے لیے ناگزیر ہے۔ جب سماج اس مرحلے سے گزر جائے تو ظاہر ہے کہ دنیا کا علمی سفر انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہوتا ہے اور کسی بھی تہذیب میں کوئی خیر ہو تو اس خیر کو قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ مگر کسی بھی قوم کا اپنا شعوری فیصلہ ہونا چاہیے کہ اس نے دوسری تہذیب سے کیا چیز حاصل کرنی ہے اور کیا نہیں۔ یہ اس پر مسلط نہیں ہونا چاہیے۔ جبر لاشعوری پسپائی میں بھی ڈھل جائے تو جبر ہی کہلاتا ہے۔

ہمارے سامنے ہے کہ انگریزی تہذیب نے رومن تہذیب سے بہت کچھ حاصل کیا۔ وہ مگر ایک شعوری فیصلہ تھا اور ایسا نہیں تھا کہ رومن آکر برطانیہ پر قابض ہو گئے ہوں اور وہاں *English Etiquette for Indian Gentlemen* جیسی کتابیں لکھ کر انگریزوں کو باور کرایا گیا ہو کہ تم تو احمق اور جاہل قوم ہو، تمہیں تو نہ بات کرنے کا سلیقہ ہے نہ کپڑے پہننے کا، تم تو وحشی ہو اور اب ہم تمہیں تہذیب سکھانے آئے ہیں۔

قوموں کی زندگی میں عروج و زوال، دھوپ چھاؤں کی طرح آتا جاتا رہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی سماج آزاد ہو کر بھی غلامی کے دور کی گرہیں نہ کھول پائے تو یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔

ہمیں سوچنا ہوگا کہ یہ احساس کمتری کب تک؟

کتابیات

مقالات

بی بی سی، "India's Supreme Court puts controversial law on hold"، 11 مئی 2022ء۔

"Allen's Indian Mail, and Register of Intelligence of British & Foreign India, China, & All Parts of the East"، جنوری، دسمبر (لندن: ڈبلیو ایم ایچ اینڈ کو، لیڈن ہال سٹریٹ، 1857ء)، 3: 238۔

پلالامری، اخلش۔ "When Elizabeth II was Queen of Pakistan"۔ دی ڈپلومیٹ، 17 مارچ، 2016ء۔

سین، امرتیہ۔ "Illusions of Empire"۔ دی گارڈین، 29 جون 2021ء۔

ایش، سرکار۔ "My great great aunt was a terrorist: women's politics went beyond the vote"۔ دی گارڈین، 5 فروری، 2018ء۔

ایمنیسٹی انٹرنیشنل اعلامیہ، "Pakistan: Overcrowding in Pakistan's prisons is a ticking time bomb"، 13 دسمبر، 2020ء۔

البتانی۔ "ابن الہیثم اور ابو کاملی، تین عظیم عرب ریاضی دان۔" بی بی سی اردو، 15 مارچ، 2022ء۔

پرویز محمود۔ "Influence of the Islamic Golden Age on the European Renaissance"۔ فرائڈے ٹائمز، لاہور، 9 جولائی 2021ء۔

جینکنز، جان فلپ۔ "White Supremacy"۔ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا۔

جوزف سرامک، "Face Him Like a Briton: Tiger Hunting, Imperialism and British Masculinity in Colonial India, 1800-1875"، وکٹورین اسٹڈیز، 48:4 (سمر 2006ء)، 659۔

جیسن ہیکل، "How Britain Stole 45 Trillion Dollars from India"، الجزیرہ، 19 دسمبر، 2018ء۔

ڈان "Asma Nawab's wrongful imprisonment sheds light on slow justice"، 20 مئی 2018ء۔

ڈان "Wrongfully Hanged"، 24 اکتوبر 2016ء۔

بھٹی، حبیب۔ "SC suspends all high court decisions regarding release of under-trial prisoners due to virus fears"، ڈان، 30 مارچ، 2020ء۔

ڈیوڈ لائبر مین، "The Challenge of Codification in English Legal History," Presentation for the Research Institute of Economy, Trade and Industry (RIETI) July 12, 2009.

ذکریا، رافعہ۔ "Acquittal After Execution" ڈان، 7 دسمبر 2016ء۔

ڈیوڈ آرنلڈ، "Police and colonial control in south India"، سوشل سائنٹسٹ (1976ء)، 4:16-3۔

سنہا، چترانسول۔ "The Roots of this Law"۔ بنگلورمرر، 23 جولائی، 2019ء۔

سید، ظفر۔ "انگریزوں نے ہندوستان کو کتنا مالی نقصان پہنچایا؟" بی بی سی اردو، 15 اگست 2018ء۔

کبرا، حرش۔ "Black Armour of Law" دی ہندو، 31 مئی، 2010ء۔

پلوفکر، کم۔ "Indian Mathematics" انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

منیر، محمد۔ "The Administration of Justice in the Reign of Akbar and Aurangzeb: An Overview"، اے جرنل آف سوشل سائنسز (اگست، 2012ء)، 5:1۔

ملک، حسنات۔ "Under-trial prisoners, Victims of slow judicial system" دی ٹری بیون، 10 فروری، 2020ء۔

ملک، حسنات۔ "Over 46000 under trial prisoners in Pakistani jails" دی ٹری بیون، 19 جنوری، 2020ء۔

گلن، نیال۔ "The controversial Irish Force sent to police Palestine" بی بی سی نیوز، 23 جنوری، 2022ء۔

بٹ، وسیم اشرف۔ "Punjab Revives old Patwar System by Replacing ACRs" ڈان، 24 اپریل، 2021ء۔

بسواس، سوتک۔ "India's Tiger Killing: A Success Story gone Wrong" بی بی سی، 6 نومبر 2018ء۔

مارکس، کارل۔ "The British Rule in India" نیو یارک ڈیلی ٹری بیون، 25 جون، 1853ء۔

کتب

گارنر برائن اے۔ *Black's Law Dictionary* نیو یارک: تھامس ویسٹ، 2014ء۔

ہچنگز، ایف۔جی۔ *The Illusions of Permanence: The British Imperialism in India* پرنسٹن: بلیک دل پبلشنگ ورسٹی پریس، 1996ء۔

ملڈرڈ، آرچر۔ *Tippoo's Tiger* لندن: ایچ ایم اسٹیشنری آفس، 1959ء۔

سنیجا، وبوک۔ *Understanding Business: A Multidimensional Approach to the Market Economy* لندن: روٹلیج پبلشرز: 2002ء۔

میڈے سن، اینگس۔ *The World Economy: Historical Statistics* پیرس: او ای سی ڈی ڈولپمنٹ سنٹر، 2003ء۔

برٹن سٹین۔ *A History of India* انگلینڈ: جان ویلے اینڈ سنز، 2010ء۔

پارتھا سارتھی۔ *Why Europe Grew Rich and Asia Did Not: Global Economic Divergence, 1600-1850* نیویارک: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، 2011ء۔

احمد، قیام الدین،ہندوستان میں وہابی تحریک، ترجمہ: پروفیسر محمد سلیم عظیم آبادی۔ کراچی: نفیس اکیڈمی، 1980ء۔

احمد، محمد بشیر، *The Administration of Justice in Medieval India*۔ علی گڑھ: ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،1941ء۔

اوون، سڈنی۔ *Fall of the Mughal Empire*۔ لندن: مرے پبلشرز،1912ء۔

راؤل وین سین ایجم۔ *Judges, Legislatures and Professors*۔ کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس،1987ء۔

آرنلڈ، ڈیوڈ، *Police Power and Colonial Rule* (آکسفورڈ: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، 1986ء۔

برچ، دینہ۔ *The Oxford Companion to English Literature*۔ نیویارک: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس،2006ء۔

ایٹن، رچرڈ۔ *India's Islamic Traditions*۔ دہلی: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس،2003ء۔

کولسکی، الزبتھ۔ *Colonial justice in British India: White Violence and the Rule of Law*۔ کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، 2010ء۔

آفتابچی، جوہر،تذکرہ الواقعات، ترجمہ: سید معین الحق۔ کراچی: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس،1955ء۔

بوتھ، مارٹن۔ *Carpet Sahib: A Life of Jim Corbett*۔ نیویارک: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس،1986ء۔

بینتھم، جیرمی۔ *Truth versus Ashhurst*۔ لندن ایڈنبرا: ٹیٹ سمپکن، مارشل،1843ء۔

بھٹی، محمد اسحٰق،برصغیر میں علم فقہ۔ لاہور: کتاب سرائے لاہور،2009ء۔

پانی کر، کے۔ این۔ *Culture, Ideology , Hegemony*۔ دہلی: ساؤتھ ایشین سٹڈیز،1998ء۔

جایوسی، سلمیٰ خدرہ۔ *The Legacy of Muslim Spain*۔ لائڈن: برل اکیڈمک پبلشرز 2005ء۔

خان، سرسید احمد،اسباب بغاوت ہند۔ کراچی: سندھ اردو اکیڈمی،1987ء۔

خان، علی محمد،میراث احمدی۔ بھارت: اورینٹل انسٹی ٹیوٹ بروڈا،1927ء۔

رینکن، جارج کلاز۔ *Background to Indian Law*۔ کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس،1946ء۔

سر برنارڈ رولینڈ کریک، (1903-1950) *Blair, Eric Aurthur George Orwell*، مشمولہ: *Oxford Dictionary of National Biography*۔

سیزگین، فواد۔تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام، ترجمہ ڈاکٹر خورشید رضوی۔ اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی،2005ء۔

علی، مبارک۔برطانوی راج: ایک تجزیہ۔ لاہور: فکشن ہاؤس،1999ء۔

آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان۔ سندھ: آگہی پبلی کیشنز،1996ء۔

فن شاو، ہربرٹ چارلس۔ *Delhi: Past and Present*۔ مدراس: ایشین ایجوکیشن سروسز،1998ء۔

قریشی، اشتیاق حسین۔سلطنت دہلی کا نظم حکومت، ترجمہ: ہلال احمد زبیری۔ کراچی: کراچی یونی ورسٹی پریس،2018ء۔

دیوگاور، کرشنا۔ *Textbook on the Indian Penal Code*۔ دہلی: یونی ورسل لا پبلشنگ کمپنی،2011ء۔

گیٹ، بریل بیک۔ *Tipu Sultan's Search for Legitimacy: Islam and Kingship in a Hindu Domain*۔ دہلی: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، 1997ء۔

گارنر، برائن اے۔ *A Dictionary of Modern English Usage*۔ نیویارک، آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، طبع دوم۔

گرا، ایلن میک۔ *The Destruction of Pakistan's Democracy*۔ کراچی: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس،1996ء۔

لینگبین، لرنر سمتھ۔ *History of the Com..non Law: The Development of Anglo-American Lagal Institutions*۔نیو یارک: ایشین پبلشرز،2009ء۔

میکالے، لارڈ تھامس بیبنگٹن۔*Minute on Indian Education*۔نیشنل آرکائیوز آف انڈیا،1965ء۔

نیازی، عمران احسن خان۔*Legal System of Pakistan*۔اسلام آباد: فیڈرل لا ہاوس، 2018ء۔

سر میتھیو ہیل،*The History of the Common law of England*۔امریکا: شکاگو یونی ورسٹی پریس،1971ء۔

مورین، والر۔ *Sovereign Ladies: The Six Reigning Queens of England*۔انگلینڈ: جان مرے پبلشرز،2006ء۔

ولیم سن، جیفری۔ *India's Deindustrialization in the 18th and 19th Centuries*۔امریکا: ہارورڈ یونی ورسٹی پریس،2005ء۔

ویب، ڈبلیو ٹی۔ *English Etiquette for Indian Gentlemen*۔کلکتہ: ٹھاکر سپنک اینڈ کمپنی،1888ء۔

عدالتی فیصلے/صدارتی فرامین/رپورٹس

PLD 1955, Sindh 96.
PLD 1955, FC, 240.
PLD 2020 SC 269.

صدارتی فرمان نمبر15،1980ء۔

پولیس کمیشن رپورٹ 1902ء(شملہ: گورنمنٹ سنٹرل پرنٹنگ آفس، شملہ،1903)،4۔

مقدمہ غلام سرور بنام سرکار،PCLJ 2588،1884ء،لاہور۔

پاکستان میں انصاف تک رسائی کے بارے میں کوئی بھی بحث مروجہ قانونی نظام کے ناقص ڈھانچے کے بارے میں گفتگو کے بغیر نامکمل ہے۔ جناب آصف محمود ایڈووکیٹ کی کتاب "پس قانون: پاکستانی قانون پر برطانوی نو آبادیاتی اثرات" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب ہمارے قانونی ڈھانچے کو نو آبادیاتی نظام کے تسلسل کے طور پر دیکھتے ہوئے اس سوال کا جواب کھوجنے کی ایک اعلیٰ کاوش ہے کہ آخر ہم انصاف کی فراہمی میں ناکام کیوں رہے ہیں۔

آصف محمود صاحب کی یہ تصنیف احساس کمتری پر مبنی نو آبادیاتی ورثے میں ملنے والے قوانین کی تشکیل اور تطبیق کے بارے میں حقائق قارئین کے سامنے پیش کرتی ہے۔ مصنف اس سوال سے آغاز کرتے ہیں کہ نظام قانون پر جو عدم اعتماد کی عمومی کیفیت ہمارے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کی کھوج میں وہ ہمیں نو آبادیاتی قانونی نظام کی ساخت اور اس کی تشکیل کے پس منظر سے گزارتے ہیں۔

میرے علم کے مطابق پاکستان میں اس سلسلے کی یہ پہلی مستقل کتاب ہے جس میں نظام قانون کے نقائص وناکامی کو نو آبادیاتی فکر کے تناظر میں موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ آصف محمود صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ ایک ایسے وقت میں جب اس نظام کے تحفظ اور اسے سہارا دینے کے لیے تحریکیں چل رہی ہیں، انھوں نے ایک بنیادی نوعیت کی بحث چھیڑی ہے۔ ان سوالات کے اطمینان بخش جوابات تلاش کیے بغیر کسی بھی قسم کے اصلاحات کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہو سکتیں۔

ڈاکٹر عزیز الرحمن
سربراہ شعبہ قانون
قائداعظم یونی ورسٹی، اسلام آباد



آصف محمود نے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے ایل ایل بی اور ایم اے انگریزی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ قانون کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ہائی کورٹ بار اسلام آباد کے رکن ہیں۔ صدر پاکستان کی جانب سے سپریم کورٹ میں دائر کردہ "بھٹو ریفرنس" میں وفاق نے بطور معاون وکیل آپ کی خدمات حاصل کیں۔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں قانون پڑھاتے ہیں۔ مزید برآں قومی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں باقاعدگی سے آپ کے کالم اور مضامین چھپتے ہیں۔ سیاست، سماج، قانون اور مذہب پر کئی تحقیقی مقالات اور کتب تصنیف کر چکے ہیں۔

فاضل مصنف جناب آصف محمود نے اس اہم موضوع پر اعلیٰ درجے کی تحقیق کر کے اسے اردو میں عام فہم اسلوب میں پاکستان کے عوام کے سامنے رکھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے قانونی و عدالتی نظام میں بامعنی اصلاحات کے خواہش مند افراد یہ کتاب شوق سے پڑھیں گے اور یہ ججز، وکلاء اور قانون کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ عام لوگوں کے لیے بھی بہت مفید ثابت ہو گی۔

جسٹس جواد ایس خواجہ

سابق چیف جسٹس آف پاکستان

شیبانی فاؤنڈیشن، اسلام آباد

شیبانی فاؤنڈیشن ایک علمی اور تحقیقی ادارہ ہے، جو مختلف شعبوں میں متعدد نوعیتوں کی تعلیمی، تحقیقی اور تربیتی سرگرمیاں منعقد کرتا ہے، جس میں فقہ، قانون، بین الاقوامی قانون، اسلامی اور سماجی علوم شامل ہیں۔

SHAYBANI FOUNDATION
Islamabad, Pakistan
www.shaybanifoundation.org

ISBN 978-627-7504-05-2

9 786277 504052

PKR 1000 USD 20$ (Export)